سری نواس لاہوٹی

سری نواس لاہوٹی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

انتساب

دوست، ساتھی اور رہبر
راجن

(ڈاکٹر راج بہادر گوڑ)

کے نام

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان		صفحہ

پیش لفظ

سری نواس لاہوٹی کی شخصیت بہت دلچسپ اور رنگا رنگ ہے جو تجربہ لاہوٹی صاحب کو ہے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، انھوں نے ۱۹۳۸ء میں کانگریس میں اس وقت شرکت کی جب آزادی کی لڑائی اپنے عروج پر تھی اور جب ملک آزاد ہو گیا اور بیشتر آزادی کے سپاہی اپنی قربانیوں کی قیمت کے طالب ہوئے تو لاہوٹی صاحب کانگریس کو چھوڑ کر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے۔ اگر وہ کانگریس میں ہوتے تو انھیں بہت کچھ ملتا۔

لاہوٹی صاحب صحافی ہیں۔ ادیب ہیں اور مترجم ہیں انھیں ہندی، اردو، تلگو اور انگریزی پر قدرت حاصل ہے انھیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ انھوں نے چھ سال تک قاضی عبدالغفار کے ساتھ روزنامہ "پیام" میں کام کیا ہے۔ وہ پانچ سال تک مسز سروجنی نائیڈو کے پرسنل سکریٹری بھی رہے ہیں۔ اس مختصر سی کتاب میں لاہوٹی صاحب کے لکھے ہوئے دس خاکے اور تین مضامین ہیں یہ خاکے ان لوگوں کے ہیں جن سے لاہوٹی صاحب کو قربت حاصل تھی یا جنھوں نے اپنی شخصیت و سیرت، زندگی و عمل سے انھیں متاثر کیا تھا۔ ان لوگوں میں ادیب، شاعر، عالم اور سیاست داں غرض ہر طرح کے لوگ ہیں۔ یہ خاکے ذاتی تاثرات ہیں۔ لیکن جن حضرات کے خاکے لکھے گئے ہیں ان کی شخصیت کے بارے میں ذاتی تجربے کی بنا پر بعض ایسی اہم باتیں کہی گئی ہیں جن کا علم ہمیں کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتا اور یہی ان خاکوں کی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار ایک ایسی عہد ساز شخصیت کا نام ہے جنھوں نے اردو صحافت اور ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ کوئی ادبی مورخ اس نام کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ قاضی صاحب مرادآباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے ——— وہ گھرانا بھی ایسا کہ اُن کے دادا حامد علی صاحب کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں سولی پر لٹکا دیا تھا اور دو دن کی جستجو کے بعد ان کی نعش جہاں ملی وہیں اسے دفنا دیا گیا اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔ قاضی صاحب اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مرادآباد میں ان کے مکان کے پڑوس میں ایک لالہ جی رہا کرتے تھے وہ رات میں پرسہ دینے کے لیے پہنچے تو قاضی صاحب کی دادی نے ان سے کہا کہ ابھی تک تو نعش نہیں ملی ہے۔ اس پر لالہ جی اور ان کی دادی ایک لالٹین ہاتھ میں لیے اس جگہ پہنچے جہاں سولی پر لٹکایا جارہا تھا۔ وہاں تلاش بسیار کے بعد نعش دستیاب ہوئی اور مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اسے وہیں دفنا دیا جائے۔ قاضی صاحب کے والد نے اپنے والد کی سنت سے انحراف کیا اور وہ خان بہادر ابرار احمد کے نام سے مشہور ہوئے جن کی پہنچ انگریز حکام تک تھی اسی لیے جب قاضی صاحب نے بی۔ اے کا امتحان دئے بغیر علی گڑھ کو خیرباد کہا تو اس پر ایم۔ اے او کالج میں ان کے ساتھیوں کو جن میں عبدالمجید خواجہ تصدق احمد ذہلی

شروانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب قریشی کے علاوہ سعیدالرحمٰن قدوائی کو بڑا تعجب ہوا مگر ان کے والد نے گورنر سے کہہ کر ان کو نہری محکمے میں ملازم رکھوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ گورنر سے کوئی ہندستانی ملنے جاتا تو اسے اپنے جوتے اتار کر ننگے پیر جانا پڑتا تھا اور یہی صورت قاضی صاحب کے ساتھ پیش آئی حالاں کہ یہ "فل سوٹ" زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کو بڑا صدمہ ہوا لیکن با دل ناخواستہ انھیں سرکاری نوکری قبول کرنی پڑی۔ زندگی میں یہ صرف دو بار سرکاری ملازمت سے منسلک رہے۔ ایک دفعہ نوجوانی میں اور دوسری دفعہ ۱۹۴۶ء میں سر مرزا اسماعیل کے اصرار وایما پر نظام حیدرآباد کی ریاست کے ناظم اطلاعات کی حیثیت سے۔ لیکن جب سر مرزا اسماعیل کو وزارت عظمیٰ چھوڑنی پڑی تو قاضی صاحب بھی نظامت اطلاعات سے مستعفی ہو گئے۔ مگر ابتدائی ملازمت کے چھوڑنے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ قاضی صاحب یو۔ پی کے اس علاقے پر تعینات کیے گئے تھے جس کی سرحد نیپال سے ملتی ہے۔ ایک دفعہ یہ دورے پر گئے اور اپنا سامان ڈاک بنگلے میں رکھ کر دفتر کے معائنہ کو گئے اور جب آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ڈاک بنگلے کے صحن میں پڑا ہوا ہے اور ایک انگریز مادر زاد ننگا ان کے کمرے میں براجمان ہے۔ اس پر قاضی صاحب کو بڑا طیش آیا اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس انگریز افسر کی چھڑی سے اتنی پٹائی کی کہ وہ ادھ مرا ہو کر بھاگ نہیں سکا تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا تب قاضی صاحب نے اسے چھوڑ دیا اور واپس ڈاک بنگلہ آ کر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مرادآباد چلے آئے۔

قاضی صاحب کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں سر محمد یعقوب کی بہن سے ہوئی جو ان کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ اس شادی میں مولانا شوکت علی نے بھی شرکت کی تھی اور سلامی کی رقم کا جو انبار دولھے کے سامنے پڑا ہوا تھا اس پوری رقم کو مولانا نے علی گڑھ یونیورسٹی کے فنڈ میں جمع کرا دیا گویا یہ ان کا رفاعی کام کا پہلا زینہ تھا۔

قاضی صاحب کی اخبار نویسی کی ابتدا (۱۶) سال کی عمر میں ہوئی جب یہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ مرادآباد سے ابن علی صاحب کی ادارت میں اخبار "نیر عالم" نکلتا تھا جس

میں ان کا تحریر کردہ ایک خبرنامہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے یہ متعدد اخباروں میں لکھتے رہے۔ صحیح معنوں میں اخبار نویسی کی ابتدا ۱۹۱۳ء میں ہوئی جب مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" نکالا۔ "ہمدرد" کے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے ادیب "ہمدرد" میں چھپنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ پریم چند کا ایک افسانہ ۱۹۱۳ء میں ہمدرد میں شائع ہوا تھا جس کا انھیں معاوضہ بھی ملا تھا۔ ہمدرد میں ان کے شرکا کار میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ مولانا شرر اور عبدالحلیم دہلوی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا تو قاضی صاحب نے مولانا محمد علی کے اشارے پر کلکتہ سے "جمہور" نکالا جو بقول قاضی صاحب کے "جمہور" بیراسب سے کامیاب اخبار تھا جس کی تعداد اشاعت (۱۳۰۰۰) تک پہنچ چکی تھی"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا آزاد بھی نظر بند کر دیے گئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں قاضی صاحب کو بھی (۶) ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد انھیں کلکتہ سے چلے جانے کا حکم ملا اور یہ مراد آباد چلے آئے مگر پھر انھیں نظر بند کر کے نینی تال بھجوا دیا گیا۔ جس پر قاضی صاحب نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "میں اپنے دادا کی سنت پر عمل کر رہا ہوں"۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے "الصباح" نکالا لیکن چھ مہینے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔

۱۹۲۱ء میں قاضی صاحب خلافت وفد کے معتمد کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے جہاں سے ۱۹۲۲ء میں واپس ہوئے۔ اس وفد میں سر آغا خاں کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی (خلافت تحریک کے صدر) ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مشیر حسین قدوائی اور سید حسن امام بھی شامل تھے۔ قاضی صاحب نے اس وفد کی روئداد "نقش فرنگ" کے نام سے حکیم اجمل خاں کی ایما پر تحریر کی جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ چناں چہ قاضی صاحب اس کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "نقش فرنگ" میری پہلی تصنیف تھی اس سے پہلے جو کچھ لکھا تھا وہ یا تو اخباری مضامین تھے یا چند ادبی مضامین جو کبھی کبھار ادبی رسالوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری زندگی کے ہنگاموں میں تصنیف و تالیف کے مشاغل کی تمام راہیں بند تھیں"۔

۱۹۲۱ء کے بعد قاضی صاحب کئی بار یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے دوروں پر گئے اور دو سال تک پیرس میں تجارت بھی کی۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں یورپ سے واپس چلے آئے اور حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد طبیہ کالج کے معتمد کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک مراد آباد میونسپلٹی کے چیرمین رہے۔ اسی زمانے میں قاضی صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استحکام میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۲۹ء میں جامعہ پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جامعہ کے اساتذہ کو آٹھ مہینے سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ حکیم اجمل خاں اس کی وجہ سے بڑے متفکر تھے۔ ایک دن انھوں نے قاضی صاحب کو بلا کر ایک ہیرے کی انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے بمبئی لے جاؤ اور وہاں فروخت کر کے جو رقم ہاتھ آئے اس سے اساتذہ کی تنخواہیں تقسیم کر دو اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ انگوٹھی کو دہلی میں فروخت نہیں کرنا۔ اس زمانے میں اس انگوٹھی کی قیمت بیس ہزار روپے آئی اور اس رقم سے جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہیں ادا کی گئیں اور جو رقم بچ رہی اسے جامعہ کے مد محفوظ میں جمع کرا دیا گیا۔

"نقشِ فرنگ" کے بعد ان کی دوسری تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" ہے جو ۱۹۲۷ء میں (۲۷) دن میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا شمار ادبِ لطیف کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط پہلے قسط وار "نیرنگِ خیال" میں شائع ہوتے رہے بعد ازاں ۱۹۳۲ء کتابی شکل میں مع تمہید و اضافے کے ساتھ شائع ہوئے۔ طوائف کا موضوع اردو ادب میں نیا نہیں ہے لیکن قاضی صاحب نے ان خطوط میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے "مجنوں کی ڈائری" لکھی جو قاضی صاحب کی انشاپردازی کا ایک دل کش نمونہ ہے۔ قاضی صاحب کی ایک اور تالیف "اس نے کہا" ہے جو خلیل جبران کی کتاب کا چربہ ہے۔ اس میں پیغمبرِ اسلام کے فلسفیانہ افکار و اقوال کو بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "تین پیسے کی چھوکری" ایک مختصر سا انشائیہ ہے جس کی زبان دودھوں دھلی ہوئی ہے۔

قاضی صاحب کی سب سے معرکتہ الآرا تصنیف • آثارِ جمال الدین افغانی •

ہے۔ چوں کہ جمال الدین افغانی دو سال تک حیدرآباد میں محب حسن کے پاس قیام پذیر تھے جو اس زمانے میں اصلاحی تحریک اور خاص طور سے طبقۂ نسواں میں اصلاح کے بڑے موید تھے۔ اس کتاب کے سلسلے میں قاضی صاحب پہلی بار حیدرآباد آئے تھے۔ قاضی صاحب کی یہ کتاب برسوں کی تحقیق وکاوش کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب کا مواد انھوں نے لندن اور پیرس کے کتب خانوں سے جمع کیا تھا۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو (ہند) نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا جو اب ناپید ہے۔ اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لیے قاضی صاحب کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور جہاں سے بھی مواد ملا اسے جمع کیا چناں چہ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کرنا اور تحقیق کرنا دونوں مماثل ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے "حیاتِ اجمل" لکھی جو حکیم اجمل خاں کی مستند سوانح عمری ہے۔ اسی طرح انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک کتاب "آثار ابوالکلام آزاد" تحریر فرمائی جو اردو میں سیرت نگاری کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔

۱۹۳۴ء کے اوائل میں انھوں نے حیدرآباد سے "پیام" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو حیدرآباد کے شاہی ماحول میں صور اسرافیل پھونکنے کے مماثل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پولیس کا ایک انسپکٹر بھی اخبار کے ایڈیٹر کی خبر لے لیا کرتا تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا لیکن انھوں نے اس وقت کے کوتوال بلدہ کو لکھ کر بھجوادیا کہ "میرے اخبار کے خلاف آپ کو جو شکایت ہے اس کو عدالت میں پیش کر دیجئے میں وہاں اپنی جواب دہی کروں گا۔ پولیس کے محکمے میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا میرے پیشے کی توہین ہے۔" اس کے بعد پولیس والوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ "پیام" کو تو کجا دوسرے اخبار والوں پر بھی ہاتھ ڈالے۔ یہ تھا حیدرآباد کا پہلا صحافتی واقعہ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ٹکر بھانت بھانت کے نوکر شاہی عناصر سے ہوئی لیکن وہ ہر ایک کی پول کھولتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ان کی آخری ٹکر کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم سے ہوئی جو اپنی یورپین ڈگری کے زور پر کتب خانہ میں من مانی چلانا چاہتے تھے۔ قاضی صاحب نے اس کے خلاف

"علم کی رسد بندی - کتب خانہ آصفیہ" کے عنوان سے جو چودا اداریے سپرد قلم کیے وہ حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں یادگار رہیں گے - اسی طرح ماچریڈی پلی میں پولیس کے وحشیانہ مظالم کو جس طرح طشت از بام کیا اور اس کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا اس کے گواہوں میں، راقم الحروف بھی شامل ہے جو اس وقت پیام کا اسٹاف ممبر تھا۔ قاضی صاحب کی صحافتی زندگی کا یہ پہلو صرف ادارتی کالموں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ان کی دلچسپیاں گوناگوں اور نوع بہ نوع تھیں - ان کا "سرراہ" کا کالم آج بھی بہت سے ذہنوں میں تازہ ہے اس کالم میں زبان کی چاشنی اور تحریر کے ایک خاص مزاحیہ انداز بیان کے ساتھ کچھ معلوماتی باتیں بھی ہوا کرتی تھیں - انھوں نے اس کالم میں انگلستان سے مسٹر ایمری کی قیادت میں جو پارلیمانی وفد ہندستان آیا تھا اس کا جو خاکہ اڑایا ہے وہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے - پیام میں شائع ہونے والے چربے، نقد و نظر، تبصرے، ع - غ کا کالم، ہر روز کچھ سوچیے یہ ایسے فیچر تھے جس کو آج بھی پڑھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں - بہرحال پیام کا ہر کالم بے مثال ہوا کرتا تھا -

قاضی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نوجوان نسل کو تیار کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین، بزم محب، کامریڈ اسوسی ایشن، حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین، انجمن صحیفہ نگاران وغیرہ کی تنظیموں کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا - حیدرآباد میں ہر ترقی پسند تحریک کو قاضی صاحب کی سرپرستی حاصل ہوا کرتی تھی - علم کی دولت اور قومی و سماجی شعور کی پختگی سے حیدرآبادی عوام کو ہم آہنگ کرنے میں قاضی صاحب نے وہ فرض انجام دیا ہے کہ مستقبل کا مورخ اسے نظرانداز نہیں کر سکتا - یہی نہیں انھوں نے سیاسی اور سماجی تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کرنے میں جو نمایاں فرض انجام دیا تھا وہ آج تاریخ کا ایک باب بن گیا ہے - یہی وہ باتیں ہیں جو ان کی روشن خیالی کی گواہی دیتی ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز تھا -

قاضی صاحب بڑے وجیہہ اور خوش خوراک و خوش پوشاک انسان تھے

کھلتا ہوا گندمی رنگ، اونچا قد، چوڑی پیشانی، خشخشی داڑھی، گداز جسم چہرے پر متانت اور آواز میں خود اعتمادی، یہ ایسی خوبیاں تھیں کہ ہر ملنے والا ان کا گرویدہ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ نئے لکھنے والوں کی ضرورت سے زیادہ ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ مجھے برسوں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے اور میں اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ اپنے (۱۶) سالہ قیام حیدرآباد میں انھوں نے ایک ایسی روشن خیال نسل کو پروان چڑھایا کہ ان کا کوئی بھی سیرت نگار ان خوبیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ وہ قلم کے دھنی تھے اور لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چناں چہ وہ اپنے لکھنے کے انداز پر یوں رقم طراز ہیں کہ "میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے کہ جب لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو لکھے چلا جاتا ہوں اور اس کے لیے صبح شام کی کوئی قید نہیں۔" قاضی صاحب نے ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ جن لوگوں نے ان کے ڈرامے پڑھے ہیں ان کو اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا شعر کہنا وقت گزاری کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ اور وہ جس کاغذ پر شعر لکھتے تھے اسے خود ہی ضائع کر دیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے ان کی بہت سی چیزیں محفوظ کر لی ہیں جنھیں کسی اور وقت کے لیے چھوڑے دیتا ہوں۔ نمونے کے لیے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پروانہ اپنی منزل آخر پر آ گیا
باقی ہے ایک شمع عزادار آرزو
اس نامراد دل کی جسارت کو کیا کروں
ہے بدنصیب اب بھی طلبگار آرزو

کہانی دل کی آخر ایک شب یوں ختم ہو جائے
کہ جیسے طفل ناداں روتے روتے تھک کے سو جائے

تو نہ سمجھے گا کہ یاں ہر قطرہ ایک گرداب ہے
جنسِ عشرت اس تماشہ گاہ میں نایاب ہے

اولڈ بائیز اسوسی ایشن، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سالانہ ڈنر میں قاضی صاحب نے جو نظم سنائی تھی اس کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں :۔

اب کون علی گڑھ آتا ہے جو جاتا ہے وہ جاتا ہے
سب بھول گئے ہم، یاد نہیں کب آتے تھے کب جاتے تھے
وہ دورِ بہاراں بیت گیا روداد جوانی ختم ہوئی
اگلوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ قاضی صاحب بہت سی چیزیں قلمی نام سے بھی شائع کرواتے تھے۔ ان کے قلمی نام ق۔ ع۔ غ کے علاوہ "خاموش" بھی تھا۔ ان کی ایک نظم "نوائے خاموش" کے عنوان سے ۱۹۲۶ء کے "ادبستان" میں شائع ہوئی تھی جس پر مصنف کے نام کی جگہ "خاموش" شائع ہوا ہے۔ اسی طرح ان کی ایک نظم ۱۹۲۱ء کی "جامعہ" میں "ق۔ ع۔ غ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

قاضی صاحب نے زندگی کے آخری دور میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے معتمد کی حیثیت سے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے نائب امیر جامعہ کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو جس طرح بچایا تھا اسی طرح سے قاضی عبدالغفار نے انجمن کے معتمد کی حیثیت سے اردو تحریک کو جو قوت نمو عطا کی وہ اردو کی ایک ناقابلِ فراموش خدمت ہے۔

قاضی صاحب ایک منفرد ادیب تھے اور ایک بے مثل انسان۔ جہاں دونوں باتیں اکٹھا ہو جاتی ہیں وہاں ادبی اور انسانی دونوں معیار بلند ہو جاتے ہیں ہمارے بزرگ ادیبوں میں

شاید ہی کوئی ادیب ایسا ملے جس نے نوجوان لکھنے والوں اور ادبی تحریکوں کی ہمت افزائی کی ہو۔ ان کی دل سوزی اور بے پناہ محبت نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو ادیب اور شاعر بنایا۔ قاضی صاحب اس کارواں کے مسافروں میں سے تھے جس میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں وہ کارواں بکھر گیا اور اس کے اکے دکے مسافر اپنے عزم بلند اور مقصد عظیم کی راہ پر رواں دواں تھے قاضی صاحب بھی ان میں سے ایک تھے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں ان کی موت اردو ادب کے ایک بلند پایہ اور حوصلہ مند قائد کی موت تھی۔ ان کو بچھڑے تیس سال ہوتے آئے ہیں لیکن ہم کہنے پر مجبور ہیں:

کہ شمع بجھ تو چکی اس کا نور باقی ہے

پروفیسر حبیب الرحمٰن ـــ سیرت و شخصیت

ایک انگریز مفکر کا قول ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی بڑے ہوا کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی صلاحیت اور کوشش سے بڑے بنتے ہیں۔ ایسے ہی بڑے لوگوں میں سے ایک پروفیسر حبیب الرحمٰن ہیں، جنھوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت جفاکشی اور تفکر و تدبر کے ذریعہ اپنی شخصیت کو کندن بنایا اور اپنے دماغ کی روشنی سے اردو تحریک کو وہ ضیا بخشی کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شخصیت کیا ہے اس پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اجمالی طور پر شخصیت جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایسا مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی فرد عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے میں حبیب الرحمٰن صاحب کے اسی امتیاز کا ذکر کروں گا۔

حبیب الرحمٰن صاحب کے والد محی الدین صاحب نواب فخر الملک بہادر کی پیشی کے معتمد تھے جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے سیاہ و سفید کے کرتا دھرتا کہلاتے تھے۔ اگست ۱۸۹۷ء میں حبیب الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی اس کے بعد انھیں دارالعلوم میں شریک کر دیا گیا جہاں ان کے ساتھیوں میں پروفیسر کلیم اللہ حسینی قابل ذکر ہیں جن کا بعد میں لندن میں بھی ساتھ رہا۔ دارالعلوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ

خانگی طور پر انگریزی کا درس لینے کے لیے مفید الانام ہائی اسکول کے ایک استاد سبرامنیم کے پاس جایا کرتے تھے جہاں ان کا ساتھ رام لال صاحب سے ہوا۔ جنھوں نے بعد میں مجلس مال ملک کے رکن کی حیثیت سے بڑا نام کمایا اور اس وقت بھی بقید حیات ہیں۔ انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے کا ذکر انھوں نے اپنے والدین سے نہیں کیا لیکن جب اس کی بھنک انھیں پڑی تو وہ اس میں مانع نہیں ہوئے انھوں نے ۱۹۱۳ء میں مدرسہ آصفیہ کے ذریعہ مڈل کا امتحان پاس کیا۔ مڈل کے کامیابی کی سند آج بھی آصفیہ اسکول کی لائبریری میں آویزاں ہے جس کے وہ برسوں معتمد اعزازی بھی رہے۔ پنجاب میٹرک کامیاب کرنے کے بعد چند دنوں تک نظام کالج میں شریک رہے، جہاں ان کے ہم جماعت نواب مہدی نواز جنگ اور نواب دین یار جنگ بہادر تھے۔ لیکن اس کے چند دنوں بعد انھوں نے ایم۔ او۔ کالج علی گڑھ میں داخلہ لے لیا، جس کا الحاق اس وقت الہ آباد یونی ورسٹی سے تھا۔ وہاں سے انھوں نے ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں ان کے ساتھیوں میں قابل ذکر ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور اکبر علی خاں بار ایٹ لا ہیں جو بعد میں جامعہ عثمانیہ میں ان کے شاگرد بھی رہے۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد ان کا ابتدائی تقرر مددگار پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں ہوا اس وقت پروفیسر الیاس برنی صدر شعبۂ معاشیات تھے۔ ان کے تقرر کے سلسلہ میں پروفیسر عبدالستار صدیقی نے بڑی مدد کی اور جب بھی ان کا ذکر آتا حبیب الرحمٰن صاحب بڑے احترام سے ان کا نام لیا کرتے تھے۔ اس وقت جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور حبیب الرحمٰن صاحب اردو میں درس دینے میں اتنے کورے تھے کہ وہ کلاس میں جانے سے ہچکچاتے تھے لیکن الیاس برنی صاحب نے ان کی ہمت بندھائی اور کلاس روم تک انھیں چھوڑتے آئے۔ جب انھوں نے اپنی زبان کھولی تو چند ثانیوں تک پریشان رہے لیکن بعد میں وہ اس قدر کامیاب استاد ثابت ہوئے کہ ان کے طالب علم انھیں عرصہ دراز تک یاد کرتے رہے۔

جامعہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ان کی پہلی اور قابل ذکر کتاب "معاشیات" ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ

معاشیات جیسے خشک موضوع کو عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے
" عالمی کساد بازاری کے اسباب " CAUSES OF WORLD DEPRSSIONS
" محصول اندازی کے اصول اور طریقے " A BOOK ON PRINCIPLES AND METHODS OF TAXETION
" مبادلات خارجہ " A BOOK ON FOREIGN EXCHANGE
" ہندستان کے معاشی حالات " BOOK ON ECONOMIC HISTORY OF INDIA
جیسی کتابوں کے تراجم کیے جو دارالترجمہ
جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع ہوئے۔ ان کے ترجمے یوں کہ مضامین نہایت ہی شستہ اور سلیس زبان میں ہیں اور جن لوگوں نے ان کو پڑھا ہے ان کا خیال ہے کہ ان کتابوں کے اس سے اچھے ترجمے نہیں ہو سکتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ درس و تدریس اور تصنیف و ترجمہ کا اتنا زیادہ کام کرنے کے باوجود انھیں معاشیات کے موضوع سے بعد میں دل چسپی باقی نہیں رہی۔ جامعہ عثمانیہ سے الیاس برنی صاحب کے چلے جانے کے بعد یہ معاشیات کے پروفیسر بنائے گئے اور ساتھ ہی ساتھ حیدر آباد سول سروس کی کچھ کلاسیں بھی ان کے ذمہ کی گئیں۔ سول سروس کے ان کے شاگردوں میں دوسروں کے علاوہ ۔ ایل۔ این گپتا، شیو کمار لال، اور ظہیر احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد ایل۔ این گپتا نے ان کی اتنی مدد کی کہ وہ ہمیشہ ان کے معترف رہے۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۲۲ء تک یہ انگلستان میں رہے جہاں انھوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے آنرز کیا اور پھر آکسفورڈ میں ایک سال تک زرعی معیشت کے شعبہ میں ریسرچ فیلو رہے۔ لندن کے ان کے ساتھیوں میں مشہور کمیونسٹ لیڈر بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی، مسز فریڈا بیدی اور بی۔ کے نہرو کے نام نمایاں ہیں۔ پروفیسر ہیرالڈ لاسکی اور پروفیسر سی۔ ای۔ ایم جوڈ کے چہیتے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا جو اپنے اشتراکی خیالات کے لیے مشہور تھے۔ یہاں ان کے جواں مرگ ساتھی ابن حسن صاحب کا بھی ذکر ضروری ہے جو علی گڑھ، لندن اور جامعہ عثمانیہ میں ان کے ساتھی اور غالی دوستوں میں سے ایک تھے۔

۱۹۳۶ء میں یہ محکمہ اطلاعات عامہ کے ناظم بنائے گئے۔ اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے ہوا یہ کہ ۱۹۳۶ء کے اوایل میں پونا میں ایک معاشی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آنے والا تھا اور اس کے صدر سر اکبر حیدری بنائے گئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا صدارتی خطبہ ایسا ہو کہ ہر سننے والا چونک جائے۔ مرحوم احمد محی الدین جو بعد میں مرکزی حکومت کے ڈپٹی منسٹر بنے انھوں نے سر اکبر حیدری سے حبیب الرحمٰن صاحب کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ انھیں لے آئیں تاکہ خطبہ صدارت پر بات چیت کی جا سکے۔ جب احمد محی الدین صاحب نے اس کا ذکر حبیب الرحمٰن صاحب سے کیا تو انھوں نے چلنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے "جی حضوری" نہیں ہو سکتی۔ لیکن احمد محی الدین صاحب چونکہ ان کے علی گڑھ کے ساتھیوں میں سے تھے اس لیے انھوں نے کسی طرح آمادہ کر لیا اور سر اکبر حیدری سے گفتگو کے بعد انھوں نے خطبہ تحریر کرکے احمد محی الدین صاحب کے حوالے کر دیا۔ جب خطبہ صدارت کانفرنس میں پڑھا گیا تو اس کی اتنی تعریف ہوئی کہ سر اکبر نے ان کو ناظم اطلاعات عامہ بنا دیا۔ جہاں وہ چھ سال تک بحیثیت ناظم کام کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ناظم صنعت و حرفت بنائے گئے اور ۱۹۴۶ء میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی جگہ انھیں معتمد صنعت و حرفت بنایا گیا۔ جب یہ معتمد صنعت و حرفت تھے تو پولیس ایکشن ہوا اور اس کے بعد کانگریس کی قائم کردہ نئی حکومت نے مسلمانوں اور خاص طور پر مسلم ملازمین کا عرصہ حیات تنگ کر دیا ان میں سے ایک حبیب الرحمٰن صاحب بھی تھے۔ اس وقت ان کے محکمہ کے انچارج ایک آئی۔ سی ایس آفیسر مسٹر پردھان تھے جو انتہائی متعصب اور تنگ نظر واقع ہوئے تھے۔ جب کوئی فائل ان کے پاس جاتی تو وہ یہ دیکھتے کہ حبیب الرحمٰن صاحب نے کسی مسلمان کی تو کوئی سفارش نہیں کی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ان کے محکمہ کے ایک معصوم مسلمان پر رضا کار ہونے کا جھوٹا جرم عائد کرکے اس کی معطلی یا برطرفی کی نیچے سے سفارش کی گئی تھی لیکن حبیب الرحمٰن صاحب اس شخص مذکور سے ذاتی طور پر واقف تھے اس لیے انھوں نے ما تحتین کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے اسے ملازمت میں برقرار رکھنے کی سفارش کی۔ اس پر پردھان صاحب اتنے چراغ پا ہوئے کہ حبیب الرحمٰن صاحب سے پوچھ بیٹھے کہ یہ آپ نے کیسی سفارش کی ہے۔ انھوں نے

اس باز پرس کا اسی لہجہ میں جواب دیا اور کہا کہ میں نے حقائق بیان کردئے ہیں اب یہ کام آپ کاہے کہ آپ میری تجویز کو مانیں یا رد کردیں لیکن پردھان صاحب کا اصرار تھا کہ وہ اس کی بطرفی کی سفارش کریں۔ اس بات سے حبیب الرحمٰن صاحب نے صاف انکار کردیا اوران کے اجلاس سے اٹھ کر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ منسٹر اور معتمد کے تعلقات معتدل نہ ہوں تو محکمہ کے کام کا انصرام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل سکتا اور یہ صورت حال کچھ دنوں برقرار رہی۔ اسی دوران حکومت کی جانب سے ایک گشتی جاری ہوئی کہ جن ملازمین سرکار نے اپنی ملازمت کے پچیس سال پورے کرلیے ہوں وہ اگر چاہیں تو وظیفہ حاصل کرسکتے ہیں۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور سرکاری ملازمت سے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کرلی۔

وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعدان کے پاس کئی آفر آئے حتی کہ پاکستان والوں نے بھی انھیں مدعو کیا لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک مرکزی انجمن ترقی اردو کا احیا عمل میں آچکا تھا اور اس کے معتمد عمومی قاضی عبدالغفار بنائے گئے تھے۔ وہ اور پنڈت سندر لال حیدرآباد آئے اور انجمن کی شاخ کے قیام کے سلسلہ میں حبیب الرحمٰن صاحب سے ربط پیدا کیا۔ قاضی صاحب حبیب الرحمٰن صاحب سے بخوبی واقف تھے اس لیے کہ وہ روز نامہ "پیام" کے ایڈیٹر تھے اور حبیب الرحمٰن صاحب ناظم اطلاعات عامہ تھے چنانچہ کوئی دقت پیش نہیں آئی پہلے تو حبیب الرحمٰن نے حسب عادت انکار کیا لیکن جب قرعہ فال انھیں کے نام نکلا تو انھوں نے مزید انکار نہیں کیا اور اردو والوں کا ایک اجتماع اپنی کوٹھی پر بلوایا جس کے لیے انھوں نے تقریباً (۸۰) دعوت نامے جاری کیے جن حضرات کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے اکثریت کی مادری زبان اردو تھی لیکن ان میں سے بہت سوں نے یہ کہکر شرکت سے انکار کردیا کہ پہلے ہی سے مسلمانوں پر آفت نازل ہے اس پر حبیب الرحمٰن انھیں اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے بعض غیر مسلم دوستوں نے ان کی ہمت بندھائی۔ اس جلسہ میں مشکل سے (۲۰) حضرات نے شرکت کی مگر حبیب الرحمٰن صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور مجروح سلطان پوری کے اس شعر کی تفسیر بن کر اردو کا کام شروع کردیا کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور آج یہ کارواں کتنا بڑا اور وسیع ہے اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
اس کے بعد سے حبیب الرحمٰن صاحب اردو زبان کی بقا و ترقی کی تدبیروں میں اتنے مصروف ہو گئے کہ جہاں پھول چند اور کانٹے زیادہ تھے اس کو انھوں نے گلزار بنا دیا۔ انجمن کے قیام کے بعد حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے طول و عرض کا انھوں نے دورہ کیا اور جہاں کہیں بھی گئے وہاں کے لوگوں پر اردو کی افادیت اور مادری زبان کی اہمیت کو واضح کیا۔ چند ہی سالوں میں انجمن حیات تو حاصل کر کے ایسی اٹھی کہ اس میں حرارت اور زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے جس کا اندازہ انجمن کی سالانہ رپورٹوں سے کیا جاسکتا ہے اور اردو تحریک کی افادیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انجمن ترقی اردو کو باوجود اس کے کہ اردو کی اب کئی دکانیں پنساریوں کی دکانوں کی طرح قائم ہو گئی ہیں جو ترقی اور عروج نصیب ہوا اس کے لیے ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ سب حبیب الرحمٰن صاحب کی خاموش جانفشانیوں کا ثمرہ ہے۔
ان کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی حال میں بھی امید و اخلاص کا دامن نہیں چھوڑتے تھے اور نہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو اس کی اجازت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کام کرتے چلے جاؤ اور یہ نہ دیکھو کہ اس کا پھل مل رہا ہے یا نہیں! وہ اس کے قائل تھے کہ

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

انجمن نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو یہ تو مستقبل کا مورخ ہی بتلائے گا لیکن اس نے اغیار کو بینا کرنے کی کامیاب سعی ضرور کی ہے اور اس کا اعتراف مرکزی انجمن ترقی اردو کو بھی ہے۔
انجمن کے قیام کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب کا دوسرا بڑا کارنامہ اردو ہال کی تعمیر ہے۔ اس کے لیے انھوں نے لاکھوں روپیے کی زمین بطور عطیہ دی۔ اس کا افتتاح ۱۹۵۶ء میں اس وقت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اس کے بعد اردو آرٹس کالج

کا قیام ان کی فکر و عمل کا ایسا آتش کدہ ہے کہ اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اردو ذریعہ تعلیم کا آندھرا پردیش ہی میں نہیں بلکہ ہندستان کا پہلا کالج تھا جس کے بعد دوسروں نے اس سے کسب فیض کیا۔ اس کالج کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے قیام نے جامعہ عثمانیہ میں دوبارہ اردو ذریعہ تعلیم کو جنم دیا اور آج تو وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ایسا سرچشمہ ہے کہ آئندہ نسلیں اسے بھول نہیں سکیں گی پولیس ایکشن کے بعد اردو کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا لیکن انجمن کے قیام نے حکومتی ایوانوں کے سکون آمیز چہ بچوں میں ایسا پتھر لڑھکا یا کہ اس کی لہروں میں آج بھی حرکت پائی جاتی ہے اس طرح اردو آرٹس کالج کا قیام مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا ایسا سنگ میل ہے کہ اس کی وجہ سے مادری زبان میں علم کے حصول کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہوگئی۔

حبیب الرحمٰن صاحب ہمیشہ عملی سیاست سے دور رہے لیکن ایک بار وہ اتنے مجبور ہوئے کہ انھیں کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے نائب صدر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ وہ سیاسیات میں ہمیشہ علاحدگی پسندی کی سخت مخالفت کرتے رہے اس کا ثبوت ان کا وہ خطبہ استقبالیہ ہے جو انھوں نے کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے اجتماع کے موقع پر حیدر آباد میں پڑھا تھا۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ "مسلمانوں کے لیے یہ مفید نہیں ہے کہ وہ انتخابات لڑنے کے لیے اپنی ایک خالص اسلامی پارٹی بنائیں اسی طرح ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ خود کو کسی ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کرلیں۔ یہ بات مناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ آپ کس طرح تصور کر سکتے ہیں کہ سارے کے سارے مسلمان ایک ہی سیاسی تصور یا آئیڈیالوجی کے حامی بن جائیں!" آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ " جہاں تک ملکی سیاست اور پارلیمانی اور دوسرے انتخابات کا تعلق ہے وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے نصب العین اور پروگراموں کو دیکھ کر اپنے سیاسی شعور کے مطابق کسی نہ کسی پارٹی میں شریک ہو جائیں چاہے وہ کانگریس پارٹی ہو یا کمیونسٹ پارٹی یا سوتنتر پارٹی یا سوشلسٹ پارٹیاں" یہ خطبہ ان کی سیاسی وسیع النظری اور غیر فرقہ واری سیاست کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہمارے دیش میں یہ رواج کثرت سے چل پڑا ہے کہ ہم غیر اہم شخصیتوں اور افراد کے بارے میں تعریف و توصیف کے پل باندھ دیتے ہیں اور تہذیبی سفیروں کے خطابات سے سرفراز کر دیتے ہیں مگر ان افراد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جنھوں نے بے غرض اردو کی خدمت کی اور سینکڑوں دلوں کو اردو کا کام کرنے کے لیے گرمایا۔ اس موقع پر مولانا آزاد کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "جب انسان بے غرض ہو جاتا ہے تو وہ بے پناہ بن جاتا ہے"۔ حبیب الرحمٰن صاحب کی اردو سے والہانہ وابستگی آج بھی انھیں بے پناہ بنائے ہوئے ہے۔ انھوں نے حیدرآباد میں اردو کے لیے ایسی متحرک زندگی گزاری کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے وہی اس بات کی گواہی دینے کے اہل ہیں۔ میں عمر کے مختلف حصوں میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا ہوں ان کی تعداد مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے ان میں سے ایک پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کی شخصیت بھی ہے جن کی سرکردگی میں مجھے تقریباً (۲۵) سال تک اردو کا کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اس لیے مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیجئے کہ حبیب الرحمٰن صاحب کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے مشن پر ڈٹے رہیں اور ہر سطح پر اس کے لیے جدوجہد کریں اور انھوں نے جو ادارے قائم کیے ہیں انھیں اور ترقی دیں تاکہ آنے والی اردو داں نسل کا مستقبل تابناک ہو سکے ان کی زندگی ایثار و قربانی کی مثالی زندگی رہی ہے ان کی خدمات کا اعتراف دراصل اپنی ہی بصارت اور بصیرت کا اعتراف ہے۔ ان کی سیرت و شخصیت تو شاعر کے اس مصرعہ کی مانند ہے کہ ؎

ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

موت ابن آدم کی میراث ہے جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے لیکن جب کسی عالم یا مورخ کی موت واقع ہوتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور یہی حال میرا بھی ہوا جب میں نے ۱۶ ر ستمبر ۱۹۸۰ء کے اخبارات میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کی موت کی خبر پڑھی تاریخ یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ قاضی عبدالغفار نے پروفیسر مجیب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا تھا اس میں پہلی بار مجھے پروفیسر ہارون خاں شروانی سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک وہ بہ حیثیت مورخ اور سیاسیات کے استاد کے بڑا نام کما چکے تھے اور پڑھے لکھے طبقے میں ان کی بڑی ساکھ تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ وہی ہارون خاں شروانی ہیں جو انگلستان میں پنڈت نہرو کے ساتھ تعلیم پانے کے علاوہ بیرسٹری کا امتحان بھی ایک ساتھ کامیاب کیا تھا البتہ یہ آکسفورڈ کے طیلسان تھے اور پنڈت نہرو کیمرج کے۔ پنڈت نہرو کے حیدرآباد میں اور ایک ساتھی بھی تھے جنھوں نے ہیروز کے پبلک اسکول کے علاوہ کیمرج اور قانون کی تعلیم بھی ان کے ساتھ حاصل کی تھی ان کا نام محمد قادر اشرف تھا جو عالم جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ شروانی صاحب نے کبھی اس بات کا چرچا نہیں کیا کہ وہ انگلستان میں قیام کے دوران میں جواہر لال نہرو کے ہم عصر رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا پتہ تو اس وقت چلا

جب کہ پنڈت نہرو ۱۹۵۶ء میں اردو ہال کا افتتاح کرنے کے لیے حیدر آباد تشریف لائے تھے اور پروفیسر شروانی جلسہ گاہ کی اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے جب پنڈت نہرو ڈائس پر پہنچے اور انھوں نے ہارون خاں صاحب کو دیکھا تو وہ فوراً ڈائس سے اتر آئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے بہت ہی نرم لہجے میں انگریزی میں کہا HOW ARE YOU HARRON?

تب مجھے پتہ چلا کہ پنڈت نہرو کا اور ان کا برسوں انگلستان میں ساتھ رہا ہے۔ چناں چہ پنڈت موتی لال نہرو پر ایک مضمون لکھتے ہوئے ہارون خاں صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں وہ ایک مقدمے کی اپیل دائر کرنے کے لیے الٰہ آباد ہائی کورٹ گئے تھے تو وہاں اچانک پنڈت نہرو سے ان کی ملاقات ہو گئی تو انھوں نے دریافت کیا کہ تم یہاں کیسے ؟ شروانی صاحب نے فرمایا کہ میں ایک مقدمے میں اپیل دائر کرنے آیا ہوں۔ اس پر جواہر لال نہرو نے جو اس وقت اپنے والد کے ساتھ پراکٹس کرتے تھے کہا کہ اپیل تو دائر ہوتی رہے گی تم میرے ساتھ گھر چلو، کھانا بھی وہیں کھاؤ اور میرے والد سے بھی ملو۔ شروانی صاحب کے اس مضمون میں اس وقت کے سیاسی حالات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس وقت ہارون خاں صاحب یوپی صوبائی خلافت کمیٹی کے معتمد اور علی گڑھ ضلع کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کارگزار تھے۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی ہارون خاں صاحب جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے اور غالباً پہلے سال کے استادوں میں اس وقت تک صرف وہی بقید حیات تھے اس لیے ان کی موت سے جامعہ کی تاریخ کا یہ باب بھی ختم ہو گیا اور اب صرف اس کی یاد باقی رہے گی۔

جب میں ہندی پرچار سبھا اور اس کے بعد انجمن ترقی اردو میں کام کرنے لگا تو مجھے ہارون خاں صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انجمن میں جب میں نے ۱۹۷۳ء میں کام کرنا شروع کیا اس وقت شروانی صاحب، انجمن کے نائب صدر تھے اور برسوں اس عہدے پر فائز رہے اور ان ہی کے مسلسل اصرار پر انھیں اس عہدے سے سبکدوش کیا گیا۔ جب انجمن کے صدر اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر غلام یزدانی

کا انتقال ہوا تو ان کی یاد کو باقی رکھنے کے لیے ایک " یادگار جلد" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے معتمد ہارون خاں صاحب ہی بنائے گئے۔ میں بھی اس کمیٹی کا ایک رکن تھا اس وقت مجھے ان کے طریقہ کار کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا کہ وہ کس طرح لوگوں سے کام لیتے ہیں اور خود کس طرح سے اپنا مفوضہ کام انجام دیتے ہیں۔ دو سال کی مقررہ مدت میں ہارون خاں صاحب کی سعی سے یہ ضخیم یادگار جلد طبع ہو کر منظر عام پر آئی تو ہر ایک کی زبان پر کلمۂ تحسین تھا۔ یہ ان کے علمی کام کرنے کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مرحوم نے سلاطین بہمنی اور قرون وسطیٰ کی دکنی تاریخ پر جو بے مثال کام کیا ہے اُسے زمانہ بھلانا چاہے بھی تو نہیں بھلا سکے گا۔ ان کی ایک عادت تھی کہ وہ کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بہت ہچکچاتے تھے اور جب وہ کام ان کے سر منڈھ دیا جاتا تو وہ اسے اس خوبی سے انجام دیتے کہ یہ بات آج کی نسل کے لیے ایک نمونہ اور قابل تقلید مثال ہے۔

بحیثیت رکن قانون ساز کونسل انھوں نے کونسل میں اردو کے مسائل پر جس بے باکی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کیا کرتے تھے اس کی کوئی اور مثال آج کے دور میں مشکل ہی سے ملے گی۔ جب بھی وہ کسی مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر ان کو چین نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو وہ مواد اکٹھا کرنے کے لیے اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے اردو ہال آجاتے اور جس مواد کی انھیں ضرورت ہوتی اسے وہ اسی وقت حاصل کر کے ہی جاتے تھے۔ اگر انھیں مواد کے حاصل کرنے میں ناکامی ہوتی تو وہ پھر کوئی اور بات کیے بغیر ہی اردو ہال سے روانہ ہو جاتے تھے۔

تاریخ اور سیاسیات کے وہ کیسے استاد تھے اس بات کی گواہی تو ان کا کوئی شاگرد ہی دے سکے گا لیکن "سیاسیات کے اصول" یا تاریخی موضوعات پر ان کی تحریر کردہ تصانیف کا جن لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ ضرور اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ ان کی ہر تحریر پڑھنے والے کی تشفی کا باعث بنی ہے۔

اچھا ادیب یا اچھا مورخ آدمی اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو اور یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہارون خاں صاحب ایک سچے انسان اور ایک

سچے مسلمان تھے۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ دل میں تو ایک بات پوشیدہ ہو مگر زبان پر وہ دوسری بات لائیں اس لیے بسا اوقات بڑی الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی تھیں اور وہ مجلس سے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے لیکن وہ گھر جاکر یہ محسوس کرتے کہ ان سے زیادتی ہوئی ہے تو وہ فوراً ہی اپنی تحریر کے ذریعہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرلیا کرتے تھے یہی ان کے اندر چھپے ہوئے انسان کی نشانی تھی ہو سکتا ہے کہ ان میں اور بھی کمزوریاں رہی ہوں لیکن ان کی یہ کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جس سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خال خال ہی ایسے انسان، ایسے استاد، ایسے مورخ پیدا ہوتے ہیں جنھیں ہارون خاں شروانی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر زور ——— چند تاثرات

ڈاکٹر زور کو پہلی بار میں نے جولائی ۱۹۴۴ء میں کل ہند اردو کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا جس کے روح رواں ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری تھے اور قاضی عبدالغفار کی ان کو سرپرستی حاصل تھی اس میں علی گڑھ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر سرور نے بھی شرکت کی تھی جو ان دنوں مولوی عبدالحق کے معتوبین میں سے تھے۔ یہ کانفرنس دراصل اس وقت کی انجمن ترقی اردو کے خلاف یا یوں کہیے کہ مولوی عبدالحق کو زک دینے کی ایک محاذ آرائی تھی۔

یہ کانفرنس حیدرآباد کے ٹاون ہال میں منعقد ہوئی تھی، جس پر اس وقت آندھرا پردیش کی مجلس مقننہ کا قبضہ ہے۔ ٹاون ہال کے پورٹیکو میں ایک موٹر داخل ہوئی اور اس میں سے کسی ایک نے دریافت کیا کہ کیا قاضی عبدالغفار ہال میں موجود ہیں۔ چپراسی نے مجھ سے دریافت کیا اس لیے کہ میں اس وقت قاضی صاحب کے اخبار "پیام" سے وابستہ تھا۔ قاضی صاحب ان حضرات سے ملنے کے لیے ہال سے باہر آئے اور میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ واپسی میں، میں نے دریافت کیا کہ یہ حضرات کون تھے تو قاضی صاحب نے جواب دیا کہ جو سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے وہ پروفیسر حبیب الرحمٰن ناظم صنعت و حرفت تھے اور دوسرے

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ــــــ اس پہلے دیدار کے بعد ڈاکٹر زور سے میری دوسری ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی، جب وہ چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ ان آٹھ سالوں میں ان سے ملاقات نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ اس وقت مجھے ادب سے زیادہ سیاسیات سے دلچسپی تھی۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک یا تو میں روپوش رہا یا پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھا۔ لیکن جیل سے رہا ہونے کے بعد جب میں نے سیاست کے ساتھ ساتھ تہذیبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا تو ہندی پرچار سبھا کے معتمد کی حیثیت سے دکنی کے نامور محقق ڈاکٹر زور سے بھی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں اور مجھے ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر زور آج سے تقریباً بیاسی سال پہلے ۱۹۰۵ء حیدرآباد کے ایک سربرآوردہ مگر پیری مریدی سے وابستہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم میں ہوئی اس کے بعد انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۲۷ء میں ایم اے کیا اور حکومت وقت کے وظیفے پر لندن یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور صوتیات ولسانیات کا درس دنیا کی مشہور جامعہ سار بون میں لیا۔ ہندستان واپس آنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل بنے اور ۱۹۶۰ء میں وہاں سے وظیفہ حاصل کرنے کے بعد کشمیر یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور پروفیسر بنائے گئے لیکن عمر نے ان سے وفا نہیں کی اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء میں وہ رحلت فرما گئے اور وہیں سپرد لحد ہوئے۔

بیسویں صدی کا ابتدائی عہد ہندستان میں شکست اور ریخت کا عہد تھا۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ جو نئی قدریں جنم لے رہی تھیں اس کے قدم جم نہیں پا رہے تھے اور خاص طور پر حیدرآباد کے جاگیر دارانہ ماحول نے ہر نئی تحریک کو خواہ وہ سیاسی ہو کہ سماجی یا تعلیمی اس سے منھ پھیر لینے کو اپنا شعار بنا لیا تھا اس میں سے کچھ روشن خیال مسلمانوں نے سر اکبر حیدری کا سہارا لے کر جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے حاکم وقت سے اجازت حاصل کی۔ اس لیے حیدرآباد میں اردو ادب کا زریں دور ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ

کے قیام سے وابستہ ہے حالاں کہ اس کے بعد بھی ایک غیر ملکی زبان کا تسلط برقرار رہا تو وہ انگریزی ہی تھی مگر اردو سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل کرچکی تھی اس لیے اس کا چلن لازمی قرار دیا گیا تھا اور اس زمانے میں اردو کی محفلیں کثرت سے آراستہ ہونے لگیں، حالانکہ اردو کا یہ پودا ایسے خطہ میں لگایا گیا تھا جو اردو کا علاقہ نہیں تھا کاش کہ اردو کا ذریعہ تعلیم مسلم یونی ورسٹی میں ہوتا تو شاید پولیس ایکشن کے پانچ سال بعد اسے وہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا جب کہ جامعہ عثمانیہ سے یک لخت اردو کا جنازہ نکال دیا گیا۔ تاہم آج بھی اردو کا چلن جامعہ عثمانیہ میں اس لیے باقی ہے کہ اس کی آبیاری میں ایسے لوگوں کا حصہ رہا ہے جن میں پروفیسر سجاد، وحید الدین، عبدالحق اور ڈاکٹر زور جیسے عالم و محقق شامل ہیں۔ ڈاکٹر زور اس متاع گراں کے امانت دار تھے جو اپنے پیش رووں کی طرح عالم و محقق ہونے کے علاوہ ایک مجلسی انسان تھے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ وہ پیدائشی استاد تھے اور ایک استاد میں جو خوبیاں ہونی چاہیئے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں وہ زندگی کا ایک نقطہ نظر رکھتے تھے اور اسی نقطہ نظر کی خاطر انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی اور نوجوانوں کا ایک ایسا قافلہ تیار کیا جو اپنے "مرشد" کے نصب العین کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کا بھی ایسا حلقہ بنایا تھا جو اپنے استاد کے سپرد کیے ہوئے کام کی تکمیل میں ہمیشہ منہمک نظر آتے تھے ان شاگردوں کو مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرنے کی جانب مائل کیا جاتا۔ اس طرح انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر زور کے جن شاگردوں نے ڈاکٹر صاحب ہی کی طرح سے ہندستان گیر شہرت حاصل کی ان میں مخدوم محی الدین، میر حسن، اشفاق حسین، سکندر علی وجد، اکبر وفا قانی، حمید الدین شاہد کے علاوہ اور بہت سی ادبی شخصیتیں شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور کا نام اردو ادب کا کوئی بھی طالب علم اس لیے نظرانداز نہیں کرسکتا کہ انھوں نے دکنیات پر کام کرکے نہ صرف اردو کی تحقیق کے لیے راہیں ہموار کیں بلکہ اردو کے نشوونما کی مستند تاریخ بھی فراہم کردی۔ ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کی تحقیق میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ انھیں بجا طور پر دکنی کا محقق اور دکنی لسانیات کے ماہرین میں

شمار کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ آج دکنی کی تحقیق میں سائنسی نقطۂ نظر سرایت کر چکا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں دونوں اردو لسانیات اور دکنی کے استاد تھے لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ ایک اسے شمالی ہند کی زبان قرار دیا کرتے تھے تو دوسرے نے اس پر جنوبی ہند کی چھاپ ثبت کر دی تھی۔

یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب میں ہندی پرچار سبھا کا معتمد تھا تو مرکزی حکومت کی اعانت و امداد سے جنوب کی چار زبانوں کی یعنی اردو، تلگو، مراٹھی اور کنڑی ادبیات کی تاریخ کی تدوین کا کام سپرد ہوا تھا اور میں اس کمیٹی کا کنوینر تھا۔ ایک مسئلہ پر یعنی ولی دکنی ہیں یا گجراتی اس پر بڑی ردوقدح ہوئی۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے ولی پر اردو ادب کی تاریخ کے لیے اپنا مضمون بھجواتے ہوئے ڈاکٹر زور کی اس رائے سے اختلاف کیا تھا ولی دکنی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر زور اس کمیٹی کے صدر نشین تھے اس لیے ہم مجبور تھے کہ ڈاکٹر زور کی رائے کو نظر انداز نہ کیا جائے لیکن ڈاکٹر مدنی نے کہا کہ اگر ڈاکٹر زور کی رائے پر زور دیا گیا تو میں اپنا مضمون کتاب میں شامل نہیں کروں گا۔ آخر میں ڈاکٹر مدنی اور ڈاکٹر زور نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ان کی کو آرا کو پروفیسر سید احتشام حسین سے رجوع کیا جائے اور وہ جو بھی فیصلہ کریں وہ ان کے لیے قابل قبول ہو گا۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے ڈاکٹر مدنی کے حق میں فیصلہ دیا اور بادل ناخواستہ ڈاکٹر زور کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔

حیدرآباد میں ڈاکٹر زور کی شخصیت بیسویں صدی کے نصف آخر تک اردو کے تحفظ و ترقی، تحقیق، تصنیف و تالیف کرنے والوں کے لیے شعاع نور بنی رہی ان کی مایہ ناز و قدآور شخصیت ایسی تھی جو جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد پروان چڑھی تھی۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کا مکمل نمونہ اور قدیم و جدید افکار و نظریات کا ایسا سنگم تھے کہ ان سے اردو کے ہر طالب علم نے مستفید ہونے کی کوشش کی اور وہ اس نور کے دریا سے سیراب بھی ہوتے رہے۔ جب یوم قلی قطب شاہ کا پہلا جلسہ ۱۹۵۸ء میں منعقد ہوا تو چار مینار سے پرانے پل تک اور وہاں سے قلعہ گولکنڈہ تک ایک جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور قدیم سواریوں اور سپاہیوں کا جو جلوس ترتیب دیا گیا تھا اس کا میں کنوینر تھا اس وقت مجھے ان کی تنظیمی

صلاحیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں ان کی اس خوبی کا قائل ہوگیا۔

اردو ادب کی ہر صنف میں انھوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ میں ان کی تمام تخلیقات کا احاطہ کرکے جائزہ لوں اور ان کی خوبیوں کو بیان کروں یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو اردو کے پنڈت، محقق، استاد اور ریسرچ اسکالر ہیں اور اس طبقے میں سوائے پروفیسر سیدہ جعفر کے کسی نے بھی قلم نہیں اٹھایا ہے اس لیے میں نے اپنے اس مضمون میں ان موضوعات کو نہیں چھیڑا جن پر ڈاکٹر زور نے قلم اٹھایا تھا اور تحقیق و تنقید کی گتھیاں سلجھائی تھیں۔ مگر ایک بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ ان کی طرز تحریر منفرد تھی ان کی نثر کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ہی طرح کا اسلوب کام میں لاتے تھے اور اس میں انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس پر بھی وہ ابتدا سے آخر تک قائم رہے اور یہی ان کی طرز تحریر کی خوبی تھی۔ میں ڈاکٹر زور کا شمار ان مقتول شعرا میں بھی کرتا ہوں جن کی انشا پردازی نے ان کی شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے، ان میں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر زور بھی شامل ہیں۔

بہرحال ڈاکٹر زور جب تک اس دنیا میں رہے بہار چمن بن کر رہے اور جس چمن کی آبیاری کی اس میں بہار لاتے رہے یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی تھی۔ اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جب تک وہ زندہ رہے اپنا اعجاز دکھلاتے رہے اور مرنے کے بعد بھی وہ اردو ادب کی تاریخ میں زندہ اور یادگار رہیں گے۔

بنّے بھائی

فرانس کے مشہور مفکر وکٹر ہیوگو نے والٹیر کی صدسالہ یادگار مناتے ہوئے کہا تھا کہ "زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو لیکن موت ہمیشہ اس کی منتظر رہتی ہے۔" اگر ہیوگو کا یہ قول صحیح ہے تو سجاد ظہیر کی موت ہماری ادبی تاریخ کا ایک فیصل شدہ واقعہ ہے۔ اور اب جب کہ ترقی پسند ادبی تحریک ایک نیا ابھار حاصل کر رہی ہے۔ اس وقت ہمارے درمیان سے اس تحریک کے میر کارواں کا اٹھ جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی فی الحال ممکن ہی دکھائی نہیں دیتی۔

سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد وزیر حسن یہیں وکالت کرتے تھے جو بعد میں سر وزیر حسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ اپنے سات بھائیوں بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں یعنی (۹) سال کی عمر میں انھیں پانچویں درجہ میں گولڈن جوبلی اسکول میں شریک کرایا گیا اسکول کے پرنسپل ایک اینگلو انڈین تھے وہ اپنی خیر خواہی جتلانے کے لیے جائز اور ناجائز طریقوں سے جنگ کے نام پر چندہ وصول کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں اسکول کے پرنسپل سے ان کی جھڑپ ہو گئی۔ پرنسپل نے کہا کہ "تمہارے والد کے پاس تو لاکھوں روپیہ ہے۔" بنّے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

اس لیے انھوں نے فوراً جواب دیا کہ "ٹیکس بھی تو ادا کرتے ہیں" اس وقت ان کی عمر مشکل سے گیارہ سال کی تھی۔ بنّے میاں اور پرنسپل کی اس جھڑپ کا یہ نتیجہ نکلا کہ طالب علموں کی اکثریت نے جنگی بانڈس نہیں خریدے۔

ان کے گھر کی فضا پر ایک طرح سے سیاست چھائی ہوئی تھی۔ ان کے والد مسلمانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے سامنے ہندستان کے لیے ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ رکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۶ء کا ماہ دسمبر ہماری قومی تاریخ کا ایک یادگار مہینہ رہے گا۔ اس سال لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ کئی برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد لوک مانیہ تلک اس اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ پہنچے تو عوام نے گاڑی سے گھوڑوں کو ہٹا دیا۔ اور اس گاڑی کو جس میں تلک سوار تھے اپنے ہاتھوں سے کھینچا۔ پورا لکھنؤ "تلک مہاراج کی جے" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس میں "کانگریس اور مسلم لیگ کا تاریخی معاہدہ" ہوا۔ اس وقت بنّے بھائی کے والد وزیر حسن مسلم لیگ کے معتمد عمومی تھے۔ اس لیے بنّے میاں کو بارہ سال ہی کی عمر میں ملک کے مشہور قائدین کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گاندھی جی، مسٹر جناح، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا آزاد کئی دفعہ ان کے مکان پر آئے اور قیام کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سجاد ظہیر کی شخصیت کی تعمیر میں ان واقعات کا بہت بڑا حصہ رہا ہے تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔ چناں چہ اس بارے میں ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک تھے۔ گاندھی جی، مسز نائیڈو، تلک اور جناح صاحب کو میں نے پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے صدر بابو امبیکا چرن مجومدار تھے۔ لیکن سب سے بڑے لیڈر تلک تھے۔ جب تلک کا جلوس امین آباد سے گزرا تو ہم سب بھائی جو پارک کے کنارے اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے "بولو تلک مہاراج کی جے"

تک جس گاڑی میں سوار تھے اس کے گھوڑے کھول دئے گئے تھے اور لوگ اسے کھینچ رہے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے مسز سروجنی نائیڈو کو پہلی دفعہ دیکھا' ان سے باتیں کیں اور ان کی تقریر سنی اور خفیہ طور پر ان کا دلدادہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے وطنی آزادی اور قومی اتحاد کا احساس مجھ میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی اس احساس میں اضافہ ہوتا گیا۔"

پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بنے میاں میں وسیع النظری پیدا ہونے لگی۔ اسی دوران میں انھوں نے کربلائے معلی کی زیارت بھی کر لی اور وہاں سے واپسی کے بعد دوبارہ اپنی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے میٹرک میں اچھے نمبرات حاصل کیے۔ لیکن ریاضی نے اس کی لٹیا ڈبو دی۔ اس وقت ملک میں عدم تعاون اور خلافت کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں ان کے دل میں بھی جوش پیدا ہوا لیکن انھوں نے تعلیم ترک نہیں کی اس لیے کہ بیان کی ہے کہ "کوئی ان کو اس راہ پر لگانے والا نہیں ملا"۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین فارسی، انگریزی اور تاریخ تھے۔ اس وقت کالج کے احاطہ کے قریب موتی برج کے پاس لکھنؤ کے تین مشہور کانگریسی لیڈروں' پنڈت ہرکرن ناتھ مسرا، چودھری خلیق الزماں اور رنگا ایر کی تقریریں ہوا کرتی تھیں جن میں بنے میاں پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے والد اودھ کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ اور قومی ذمہ داریوں کو بنے میاں نے سنبھال لیا تھا۔ چناں چہ وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں کہ:

"میں نے ان تمام حالات اور فضا سے متاثر ہو کر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ سر کے بال منڈوا لیے تھے، گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، چٹائی بچھا کر زمین پر سوتا تھا۔ ہمارے خاندان والوں' ابا کے دوستوں اور احباب اور شہر میں عام طور پر یہ خبر پھیل گئی کہ وزیر حسن کا چھوٹا تو کانگریسی ہو گیا ہے۔ میں نے چرخہ کاتنا شروع کر دیا تھا۔ میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نہ کبھی وہ اس موضوع پر مجھ

سے گفتگو کرتے تھے۔"

۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں انھوں نے کالج کی لائبریری سے حاصل کر کے کئی انگریزی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں اناطول فرانس اور رسل کی کتابوں نے ان کے دماغ پر بڑے گہرے اثرات مترتب کیے۔ رسل کی کتابیں پڑھنے کے بعد بنے دہریت کی جانب مائل ہونے لگے۔ انٹرنس کامیاب کرنے کے بعد جامعہ لکھنؤ میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ تاریخ، معاشیات اور انگریزی ادب ان کے خاص مضامین تھے۔ اس وقت ڈی۔ پی۔ مکرجی ان کے اکنامکس کے پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں کارل مارکس کا نام لینا بھی خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب ایک دن پروفیسر مکرجی نے کلاس میں کہا کہ "آج کل بہت سے اکانمسٹ مارکس کے نظریوں کو غلط بتاتے ہیں۔ لیکن تم لوگ ان کی باتوں میں نہ آنا۔ مارکس کے نظریے ہی دنیا میں پھیل رہے ہیں اور ان کے اثرات سے دنیا بدل رہی ہے۔ مارکس کو غلط ثابت کرنے والوں کو دنیا جھلاتی رہی ہے۔" اس وقت کانپور میں "میرٹھ کانسپریسی کیس" کی شنوائی ہو رہی تھی، اس میں مظفر احمد، ڈانگے، گھاٹے اور شوکت عثمانی وغیرہ ماخوذ تھے۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ اس مقدمے کے ذریعہ کمیونسٹوں کو کچل دیا جائے۔ اس کے بارے میں ایک جگہ بنے لکھتے ہیں کہ:

> "یہ مقدمہ کافی دنوں تک چلا تھا۔ روز صبح کو اس کی روئیداد "پائنیر" (جو خالص اینگلو انڈین سرکاری اخبار تھا) میں چھپتی تھی۔ میں اس کا ایک ایک لفظ بڑے انہماک سے پڑھتا تھا اور پھر اس کے تراشے بناتا۔ اس طرح گویا میری، اور میری طرح کے بہت سے نوجوانوں کی کمیونسٹ تحریک کے متعلق ابتدائی تعلیم ہوئی۔ یہ بہت ناقص اور ناکافی تھی لیکن اس میں ابتدائے عشق والی سرشاری کی کیفیت تھی۔"

۱۹۲۶ء میں انھوں نے بی۔ اے کامیاب کیا۔ لیکن خرابیٔ صحت کی بنا پر انھیں ایک سال ولایت جانے کے لیے رک جانا پڑا۔ اس دوران میں انھوں نے فارسی اور ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں یہ ولایت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت

ان کے بڑے بھائی حسین ظہیر ہائیڈل برگ (جرمنی) میں کیمیا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ پیرس بھی آکر ان سے ملے اور اس کے کچھ دن بعد جامعہ آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں انھوں نے اپنے لیے تاریخ جدید، معاشیات اور سیاسیات کو منتخب کیا تھا۔ اس وقت وہاں ان کے استاد پروفیسر جی۔ ڈی ایچ کول تھے۔ جامعہ آکسفورڈ میں رجعت پسندوں کا زور تھا اور تمام استاد قدامت پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت یہ آکسفورڈ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ اس لیے کہ ان پر دق کا حملہ ہوگیا۔ اور انھیں مجبوراً جامعہ کو خیرباد کہہ کر علاج کے لیے سوئزرلینڈ چلا جانا پڑا۔ جہاں ایک سینی ٹوریم میں بہ بغرض علاج داخل ہوگئے۔ یہاں سال بھر کے قیام کے دوران ان کی صحت پر کافی اچھا اثر پڑا اور وہ یہاں فرانسیسی زبان وادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ روس اور کمیونزم سے متعلق بھی ان کو یہاں کافی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا اور پہلی دفعہ انھوں نے ایک روسی فلم بھی دیکھی اس وقت ان کے ساتھ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی تھے۔

۱۹۲۸ء میں انھوں نے دوبارہ آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔ یہاں پر ان کی برٹش پارلیمنٹ کے کمیونسٹ رکن سکلت والا سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت محمود الظفر بھی یہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لیے قدامت پسندوں کے اس قلعے میں انھوں نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ لندن میں ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد جیسے اور بہت سے ہندستانی نوجوان ساتھی موجود تھے۔ ان ہی کی ایما سے سجاد ظہیر بھی لندن کی ہندستانی کانگریس کے رکن بن گئے۔ آکسفورڈ میں ہندستانی طالب علموں کی ایک انجمن تھی۔ بنے اس کے نمائندے کی حیثیت سے فرانکفرٹ میں ہونے والی مخالف سامراجی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ان کو سویت نمائندوں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ اسی سال لندن میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا جس میں یہ بھی شریک ہوئے۔ اور ان کو پولیس کی لاٹھیاں کھانی پڑیں۔ جلوس کے بعد یہ اور ان کے بہت سے ساتھی شاہ پور جی سکلت والا کے مکان پر جمع ہوئے اور وہاں سے واپسی پر "ہائی گیٹ کے قبرستان" میں پہنچے، اور یہاں ایک نئے مرشد کے مزار پر انھوں نے وہ عہد کیا جس کو مرتے دم تک

نبھاتے رہے۔ یہ مرشد کوئی اور نہیں کارل مارکس تھا۔

۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ سے بی۔ اے کرنے کے بعد یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرتے ہوئے ہندستان واپس ہوئے۔ سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھی تھیں۔ جو بعد کو "انگارے" میں شائع ہوئیں۔ ہندستان میں اس کتاب کے شائع ہوتے ہی اس کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ سجاد ظہیر کی پہلی کاوش نہیں تھی۔ بلکہ اس سے قبل ان کی کئی کہانیاں "زمانہ" میں شائع ہو چکی تھیں۔

ہندستان میں چھ ماہ قیام کرنے کے بعد یہ دوبارہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ اب ان کا قیام لندن میں تھا اور وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت سیاسی کاموں میں صرف کرنے لگے تھے۔ اس وقت تک انھوں نے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ یہ مزدوروں کے جلوس میں شامل ہوتے اور ان کی تنظیموں میں کام کرتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے وقت جب گاندھی جی لندن پہنچے تو بنے میاں اور ان کے ساتھیوں نے گاندھی جی سے ان کے لائحہ عمل پر گفتگو کی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔ اسی زمانے میں یہ ہندستانی طالب علموں کی جانب سے شائع ہونے والے رسالہ "بھارت" کی ادارت بھی کرنے لگے اور اس سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے "نیو انڈیا" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس وقت یہ قانون کے طالب علم تھے لیکن ان کا پورا وقت رالف فاکس، ڈیوڈ گیسٹ اور مارس کنفرتھ اور دوسرے مارکسی ادیبوں کی صحبت میں گزرتا تھا اور قانون جسے یہ پڑھنے کے لیے لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک غیر اہم سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ بالکل معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سمجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی

کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ملتا جاتا تھا۔ جامعاتی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لا متناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔"

یہ وہ دور تھا جب کہ فاشزم اپنے عروج پر تھا۔ دوسری عالمی جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اور " دنیا کی تہذیب برلن کی سڑکوں اور چوراہوں پر جل رہی تھی، اٹلی کے گلی کوچوں میں اس کا خون بہایا جا رہا تھا۔ اسپین میں اس پر بمباری کی جا رہی تھی۔ ایشیا کے ملکوں میں، ہندستان اور چین میں بیرونی سامراج قومی تہذیبوں کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ہٹلر یہ کہہ کر ادیبوں اور دانشوروں کو اپنی اپنی سمت کا انتخاب کرنے پر مجبور کر رہا تھا کہ جو کوئی فاشزم کے ساتھ نہیں اسے فاشزم کا دشمن سمجھا جائے گا۔" اسی زمانے میں سجاد ظہیر نے ڈاکٹر ملک راج آنند اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہندستانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور یہ اس کے کنوینر منتخب ہوئے۔ اس انجمن کا پہلا اعلان نامہ لندن کے ایک ریسٹوران میں تیار کیا گیا جس پر ہندستان کے بڑے بڑے محترم ادیبوں نے بعد کو دستخط کیے اور پھر اسی اعلان نامے کی بنیاد پر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اسی زمانے میں جب فرانس میں ادب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے روماں رولاں، آراگواں، طامس مان، ہنری باربس، گورکی اور دوسرے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے ایک مخالف فسطائی ادیبوں کی انجمن کی بنیاد ڈالی اور اس کا پہلا اجلاس پیرس ہی میں منعقد ہوا تو اس وقت سجاد ظہیر ہی ہندستانی ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ہندستان کی جانب سے بین الاقوامی ادیبوں کے اس اجتماع کو پھر پور یقین دلایا کہ ہندستانی ادیب بھی ان کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس کانفرنس کے لیے ایک سندیش بھجوایا تھا۔ اس

کانفرنس کا حال سجاد ظہیر اپنے ایک مضمون میں یوں بیان کرتے ہیں:

"یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کے ہر مذہب و قوم کے ادیب باہم صلاح و مشورہ کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لیے ان کو اپنی انفرادیت کو خیر باد کہہ کر خود اپنی ایک جماعت کا منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہ ایک موثر طریقہ ہے۔ جس کے ذریعہ وہ ترقی و فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشو و نما کا پورا پورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح سے جماعتی حثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدے کے ادیب جمع تھے۔ لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے اور وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادیٔ خیال و رائے کے حق تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر مظالم کریں تو اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے "متحدہ محاذ" کا جزو بن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی کریں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کومنٹرن کی ساتویں کانگریس نے جو ۱۹۳۵ء میں منعقد ہوئی تھی ساری بین الاقوامی کیمونسٹ تحریک کو جس میں ہندستان کی کیمونسٹ تحریک بھی شامل ہے ایک نیا رخ دیا اور تمام نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ملکوں میں ایک وسیع قومی محاذ اور ایک عالمی اتحاد کے قیام کے لیے جو آواز دی اس کا اثر ہماری قومی تحریک پر بھی پڑا اور کانگریس کے اندر بائیں بازو کی طاقتوں نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور دوسری جنگ کے آغاز کے وقت اس لائن کے انتہائی مثبت نتائج سامنے آئے۔ ایک طرف

ہمارے ملک میں کسانوں مزدوروں اور طلبا کی تنظیمیں قائم ہوئیں تو دوسری طرف تہذیبی محاذ پر ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے آپ کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا اور یہ وہ محاذ تھا جس کی رہنمائی سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے کی جنھیں ٹیگور، پریم چند، عبدالحق اور پنڈت نہرو کی سرپرستی حاصل تھی۔

۱۹۳۵ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد ہندستان واپس ہوئے۔ یورپ کے دوران قیام کا انھوں نے ایک مضمون میں جو " یادیں" کے نام سے شائع ہوا ہے بڑے ہی دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون کیا ہے گویا اس وقت کی پوری سیاسی سرگرمیوں کا ایک واضح عکس ہے جس کو انھوں نے بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے اور یہی انداز بیان اور طرز تحریر مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اپنی واپسی کے دوران میں یہ کچھ دنوں کے لیے پیرس میں رک گئے اور اپنا زیادہ تر وقت انھوں نے "لندن کی ایک رات" کے لکھنے میں صرف کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہاں کے ترقی پسندوں سے بھی راہ و رسم پیدا کی جن میں رومان رولاں، لوئی آراگاں اور آندرے جید جیسی قابل ذکر ہستیاں شامل ہیں۔ ان ادیبوں سے انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے متعلق بھی تبادلۂ خیال کیا تاکہ ان لوگوں کے تجربات کی بنیاد پر ہندستان میں بھی ایسی انجمن کو منظم کیا جا سکے۔ جب انھوں نے آراگاں سے دریافت کیا کہ ہمارا ارادہ بھی ہندستان میں اس تحریک کو شروع کرنے کا ہے اور اس کے لیے ہم آپ کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آراگاں نے خاص فرانسیسی طرز سے دونوں ہاتھ اٹھالیے اور مسکرا کر جواب دیا کہ:

> "یہ نہ پوچھئے ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر مشکل دنیا میں اور کوئی جماعت کی تنظیم نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ نکالنے کی کوشش کرتا ہے تاہم ہمیں مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ زمانے کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی حفاظت اور ترقی کے لیے منظم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

ہندستان واپس ہونے کے بعد والدین کو بنے میاں سے بہت امیدیں وابستہ تھیں گھر والوں کو امید تھی کہ بنے بیرسٹری کی سند لے آئے ہیں اور اب کچھ کر سکتے ہیں۔ بنے میاں نے الہ آباد میں پریکٹس شروع کردی جہاں ان کے والد کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن وکالت صرف بیرسٹری کی سند حاصل کرلینے سے تھوڑی ہی چلتی ہے۔ اس کے لیے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے۔ نسلی امتیازات کے دلدل میں پھنسے ہوئے اس وقت کے انگلستان کے اعلیٰ طبقات کے معاشرے کی بہ نسبت انھیں انگریز کمیونسٹوں کا معاشرہ بہت ہی متاثر کن معلوم ہوا، اور بہت سے قابل ذکر ہندستانی طالب علموں کی طرح یہ بھی اس جانب راغب ہوئے۔ بنے میاں اس معاشرہ کا جتنا قریب سے مطالعہ کرتے گئے اتنا ہی ان پر زیادہ اثر پڑا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں قومی آزادی اور بین الاقوامی امن کا راستہ صاف دکھائی دینے لگا۔ ملک کی مذہبی، سیاسی اور سماجی گتھیاں ایک ایک کرکے ان کے سامنے آنے لگیں۔ لیکن ان گتھیوں کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آکسفورڈ کا طیلسان اور بیرسٹر بن جانا ایک ضمنی چیز تھی۔ انھوں نے تو اپنے آپ کو ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے ڈھال لیا تھا اسی لیے وکیلانہ دل و دماغ پیدا نہیں کرسکے۔ اب ان کا زیادہ تر وقت "آنند بھون" میں کانگریس کے کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اس وقت جواہر لال نہرو صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اور بنے الہ آباد سٹی کانگریس کمیٹی کے منتخب معتمد۔

اسی زمانے میں وہ دو سال تک صوبائی اسمبلی کے رکن رہے بعدازاں ۱۹۴۵ء میں دوسرے کمیونسٹ ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے بھی کانگریس سے استعفیٰ دیدیا کانگریسی کارکن کے ساتھ ساتھ وہ سوشلسٹ پارٹی کے بھی سرگرم کارکن بن گئے اور اسی زمانے میں "نیا بھارت" کے نام سے ہندی ہفتہ وار اخبار نکالنے لگے۔ اس دوران انھوں نے "بیمار" نامی ایک ڈرامہ بھی لکھا جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ الہ آباد کے قیام کے دوران یہ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم میں بھی حصہ لینے لگے۔ اور صوبائی کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے میں انھوں نے کامریڈ بھاردواج کا ہاتھ بٹایا۔

۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منشی پریم چند کی

صدارت میں منعقد ہوئی تو یہ اس کے معتمد عمومی چنے گئے اور جو شمع ۱۹۳۶ء میں روشن ہوئی تھی اور جو تقریباً پچاس سال سے ہمارے ملک میں ترقی پسند اہل قلم کی شیرازہ بندی کر رہی ہے اس تحریک کا یہ کارنامہ ہے کہ "اس نے ادب کے سامنتی ڈھانچے کے بخیے ادھیڑ دیے اور اس تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد صرف تفریح طبع ہے۔ اس ادب نے مزدوروں اور کسانوں اور مظلوم درمیانی طبقے کی زندگی اور مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور ادب میں حقیقت نگاری کی بنیادیں استوار کیں۔" اور ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو اسے کمیونزم کا ایک شاخسانہ کہتے ہیں کیونکہ ہر وہ بغاوت جو قدیم کے خلاف کسی قوم کے جدید عناصر کرتے ہیں، قدامت کے دیوتاؤں کو آزردہ کر دیتی ہے اور وہ تعمیری اور صحت مند ادبی روایات کو روکنے کے لیے بہانوں کی تلاش کرتے ہیں۔ ہماری اس تحریک میں بھی کئی موڑ ایسے آئے لیکن بنے بھائی کی قیادت نے ہر مشکل کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور کشتی کو بھنور میں پھنسنے نہیں دیا۔

۱۹۳۶ء کے اواخر میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارت کے برسر اقتدار آنے کے بعد انھیں رہائی ملی۔

۱۹۳۸ء میں ان کے سر پر سہرا باندھا گیا۔ بیوی رضیہ بھی انھیں اچھی تعلیم یافتہ اور مصنفہ ملیں۔ شادی کے بعد رضیہ نے بھی جامعہ الہ آباد سے درجہ اول میں ایم۔ اے کامیاب کیا۔ رضیہ کو شادی کے وقت بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا شوہر ایک بڑے خاندان کا سپوت اور آکسفورڈ کا گریجویٹ اور انرٹیمپل کا بیرسٹر ہے اور جس کی شہرت ہر ایک کی زبان پر ہے مگر جب رضیہ بیگم، سجاد ظہیر کے گھر آئیں اور ان کا جائزہ لیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں نے اپنے میاں کو "پاگلوں" کے راستے سے ہٹا کر "صحیح راستہ" پر لگانا اپنا فرض سمجھا۔ کیونکہ ان کو اپنے آپ پر اعتماد تھا اور میاں کو بھی ان سے کافی محبت تھی۔ رضیہ بنے میاں کو "راہ راست" پر لانے کی کوششوں میں مصروف ہی تھیں کہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کا دن آن پہنچا اور بنے میاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ جیل میں بند کر دیا گیا۔ دوران نظر بندی سجاد ظہیر نے رضیہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ ہر قومی کارکن کے لیے نشان راہ ثابت

ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں رضیہ کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

"میں تو صرف اس امید پر جیتا ہوں کہ ہم اپنی جذباتی یگانگت کی بنا پر اپنی مشترکہ زندگی کا مستقبل میں ایسا نقشہ بنائیں جہاں ہم ذہنی اور رومانی توازن بھی جسمانی میل کے ساتھ ساتھ قائم رکھ سکیں۔ ہماری گزشتہ ناہمواریاں اور ناکامیاں اس کام میں ہماری مددگار ہوں گی اور اس وقت مجھے کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ کیوں ہم اپنی اس نئی مشترکہ زندگی کو مکمل طور پر کامیاب نہ بنا سکیں ——— کیوں نہیں ——— مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ مجھے تم پسند ہو، اچھی لگتی ہو، تم میں وہ ذہنی صلاحیت ہے۔ جس کی میں اپنی شریک زندگی میں ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ہمارے ارادے بلند ہیں۔ ہم دنیا میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی ہمارے سامنے نئے مسئلے، نئی گتھیاں اور مشکلات حل کرنے کے لیے پیش کرتی رہے گی۔ لیکن اس مستحکم اعتماد، ہمدردی، عشق اور محبت کے مضبوط بازو ہماری مدد کریں گے اور ہم دونوں مل کر مشکل ہم کو سر کر لیں گے۔ تم پریشان نہ ہو، کیا تمہیں اس کا غم ہے کہ ہم نے اپنی زندگی سے بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ لیکن زندگی کو اس کے لمحات اور وسعت سے نہ ناپو!"

یہ ان ہی خطوط کا نتیجہ تھا کہ رضیہ کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی پڑی اور وہ ان کی راہ میں حائل ہونے کے بجائے ایک سچے مددگار کی حیثیت سے کمر باندھ کر تیار ہو گئیں۔ پورے دو سال جیل میں نظر بند رہنے کے بعد ۱۴ر مارچ ۱۹۴۲ء کو بنے جیل سے رہا ہوئے اور پھر اپنی راہ پر چلنے لگے۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ رضیہ بھی پارٹی کارڈ ہولڈر بن گئیں۔

سجاد ظہیر جیل سے رہا ہونے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر بمبئی بلا لیے گئے اور ان کے ذمہ پارٹی کے اخبارات کی ادارت سونپ دی گئی۔ ہندستان میں شاید ہی کوئی ایسا اردو لکھا پڑھا آدمی ہوگا جس نے "قومی جنگ"، "نیا زمانہ"

اور " ساتِ دن " کا نام نہ سنا ہو' سجاد ظہیر نے بمبئی کے قیام کے دوران میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی دفتر کو لکھنؤ سے بمبئی منتقل کر لیا اور سارے ہندستان میں ترقی پسند ادیبوں کو منظم کرنے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد میں منعقد ہونے والی ترقی پسندوں کی کل ہند کانفرنس اس تحریک میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس نے انھیں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا معتمد منتخب کیا اور یہ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں پر بائیں بازو اور خاص طور پر پارٹی کو منظم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ جس سے خائف ہو کر وہاں کے حاکموں نے ان کو اور فیض احمد فیض کے علاوہ کچھ اور فوجی افسروں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں پر ایک من گھڑت سازشی مقدمہ چلایا گیا۔ جو " راولپنڈی کانسپریسی کیس " کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد ٹرائل تھا جہاں نہ تو ملزمین کو اپنی پسند کے وکیل مقرر کرنے کا حق حاصل تھا اور نہ عوام ہی اس مقدمے سے واقف ہو سکتے تھے۔ کیونکہ یہ مقدمہ " حیدر آباد' سندھ جیل' میں چلایا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساری دنیا کے جمہوریت پسند انسانوں نے ایک ہو کر بہ آواز بلند کہا کہ یا تو سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے یا انھیں غیر مشروط رہا کر دیا جائے۔ آخر چار سال بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ اور یہ دوبارہ ہندستان واپس آنے کے بعد پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے تہذیبی محاذ پر کام کرنے لگے۔

۱۹۵۶ء میں انھیں کی ایما پر تیس ملکوں کے ترقی پسند مصنفین نے جو افرو ایشیائی ملکوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ دہلی میں اپنا اجتماع منعقد کیا جس میں تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ اس طرح افرو ایشیائی مصنفین کی تحریک کے تصور نے جنم لیا جس کا مقصد ان دو براعظموں میں آباد قومی ادب اور تہذیبوں کو فروغ دینا تھا۔ اس طرح اجتماع کے بعد پندرہ برسوں میں ادیبوں کی اس تحریک نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی جو بین الاقوامی تغیرات، متعدد قومی ادیبوں کے فروغ جدوجہد آزادی اور قومی

تعمیر نو کے منصب پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ الما تا میں اس تنظیم کی پانچویں کانفرنس ۴ر ستمبر سے ۱۰ر ستمبر ۷۳ء۱۹ کو منعقد ہوئی۔ جس میں سجاد ظہیر نے ہندستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس کے افتتاحی اجلاس میں "ترقی پسند ادب اور ہندستانی آزادی وسماجی ترقی کی جدوجہد" کے موضوع پر اپنا مقالہ بھی پڑھا اور اس کے بعد ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ۱۳ر ستمبر ۷۳ء۱۹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔

بنے بھائی جنتا کے آدمی تھے اور اسی لیے انھیں عوام کی زبان اور اس کے گیتوں اور شاعری سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اپنی مادری زبان یعنی جون پور میں بولی جانے والی بھاشا میں لینن پر ایک آلہا بھی لکھا تھا۔ اور جب وہ خود اس کو جون پور کے دھوبیوں کی زبان میں سناتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دیہاتی اپنی زبان میں عوام کو انقلاب کا پیام دے رہا ہے۔ چنانچہ وہ ہندستانی عوام کے تعلق سے اپنے غیر متزلزل عقیدے کے بارے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

" جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس جہاد اکبر میں سب سے زیادہ جس چیز نے میری مدد کی وہ ہندستانی عوام ہیں یعنی مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کی جدوجہد ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کو آزاد، خوش حال اور مہذب بنانے کے لیے جاری رکھی ہے اور جس کا ایک ناچیز حصہ بننے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے۔ اس جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی میری نظر میں یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک موجودہ دور میں سب سے زیادہ باشعور جماعت بھی ہے۔ میرے نزدیک وہ ہماری قوم کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس مارکسی نظریے پر اس کے عمل کی بنیاد ہے۔ سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہتر، زیادہ منصفانہ اور زیادہ لطیف اور بارآور ترتیب و تنظیم

کرنے کے لیے اس نظریہ سے زیادہ سائنٹفک نظریہ نوع انسانی کے پاس اس عہد میں اور کوئی دوسرا نہیں ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نظریے کو محض کتابوں کو پڑھ کر یا کسی الہامی ذریعہ سے سکھایا، یا سمجھایا نہیں جاسکتا۔ مارکسزم درحقیقت فطرت اور سماج میں حرکت اور تبدیلی، زوال اور ارتقاء کے قوانین کو سمجھنے اور اس علم کے ذریعے اور وسیلے سے اپنے فہم و ادراک کو جلا دینے ایسے عمل کا نام ہے جس کا تقاضا سماجی زندگی کی ہیئت ایک خاص موقع پر کرتی ہے۔"

آخر میں چکبست کے اس شعر پر بنّے بھائی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں کیونکہ یہ شعر مرحوم پر صادق آتا ہے۔

درد دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

مخدوم ـــــــ چند تاثرات

مخدوم کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو رہے ہیں اور آج جب میں ان پہ لکھنے کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اور زندگی کی ایک ایک بات کی یاد آرہی ہے۔ مخدوم میرے لیے صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ دوست، رہبر اور ساتھی بھی تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں ہوئی جب ہم کامریڈز ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ محلہ دارالشفا میں منعقد کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ حیدرآباد میں مخالف فاشزم اور مخالف سامراج تحریکوں کے زیر اثر نوجوانوں کا ایک گروہ ابھر رہا تھا اور اس گروہ کے رہنما دوسروں کے علاوہ مخدوم محی الدین بھی تھے اور اس گروہ کی ابتدائی تنظیم کامریڈز ایسوسی ایشن تھی۔ اس وقت مخدوم غالباً اڈیکمیٹ میں یونی ورسٹی کے قریب سکونت پذیر تھے۔ میں اور میرے ایک ساتھی جواد رضوی مکان تلاش کرتے ہوئے ان کے گھر پہنچے تو وہ اپنے کمرے میں محو مطالعہ تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور وجہ بیان کی کہ ہمارے جلسے میں انھیں شریک ہونا ہے۔ انھوں نے حامی تو بھرلی لیکن جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ خارش میں مبتلا تھے اور کسی بھی محفل میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔

اس کے بعد سے ہر روز ملاقاتیں ہونے لگیں اور انھوں نے ہمیں سیاسی پنج پر لگانے میں رہنمایانہ رول ادا کیا۔ ابتدا میں۔ میں ان کی شاعری سے زیادہ ان کے سیاسی رول سے بہت متاثر تھا لیکن جوں جوں سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ادبی شعور میں پختگی آنے لگی تو میں ان کی شاعری سے بھی دلچسپی لینے لگا جو آخری وقت تک باقی رہی اور پھر ایک منزل تو ایسی بھی آئی کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں ان کی شاعری کے رازداں بن گئے اور جب کبھی کوئی چیز " نازل " ہو جاتی تو سب سے پہلے ہمیں اس سے " مستفید " ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بلدہ (حیدرآباد) میں نہیں تھا لیکن شاعر میں سنانے کی جو خواہش ہوتی ہے وہ دبائی نہیں جاسکتی، چنانچہ ایک بار غزل کے وارد ہونے کے بعد جب کوئی نہیں ملا تو انھوں نے " دیکا جی " کے ایک بیرے کو مخمور کرکے غزل سنائی اور ذہنی سکون حاصل کیا۔

مخدوم کو پہلی سزا کا مجرم قرار دلوانے میں بھی میرا بڑا حصہ رہا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جینتی کے موقع پر " حیدرآباد کھادی پرچار سنگھ " جس کا میں معتمد تھا ایک جلسہ عام حشمت گنج میں منعقد ہوا تھا اس میں مخدوم نے بڑی سخت تقریر کر دی۔ ان کی یہ تقریر نہ صرف وائسرائے کے خلاف تھی بلکہ اس میں انھوں نے ان کے نمک خواروں کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان میں حیدرآباد کے نظام بھی شامل تھے۔ حکومت وقت نے اس تقریر کا نوٹس لیا اور مخدوم کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ اکبر وفا قانی کے علاوہ بی رام کشن راؤ بھی ان کے وکیل تھے جو بعد میں پہلے جنرل الیکشن کے بعد حیدرآباد کے چیف منسٹر بنے۔ انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے ملزم کی مدافعت کی لیکن ڈاکٹر سیادت علی خاں نے جو جج تھے سزا سنا ہی دی اس طرح مخدوم کو تین مہینے کے لیے سنٹرل جیل، چنچل گوڑہ کی ہوا کھانی پڑی۔ اسی سزا کے دوران ان کا پہلا مجموعہ کلام " سرخ سویرا " شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔

میرے اس مضمون کا خاص موضوع ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں بحیثیت دوست ساتھی اور انسان کے مخدوم کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

ظاہر ہے کہ ان باتوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۲ء تک کا زمانہ حیدرآباد کے لیے بڑا ہیجانی تھا ہر آن واقعات بدلتے جارہے تھے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء کے اواخر تک میرا اور مخدوم کا کوئی ساتھ نہیں رہا۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے اواخر میں گرفتار کرلیا گیا اور ۱۹۴۸ء میں چند دنوں کے لیے رہائی عمل میں آئی اور دوبارہ ۱۹۴۹ء میں پھر دھر لیا گیا اور ۱۹۵۱ء کے آخر میں رہا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلے انتخابات کی ہماہمی بڑے زوروں پر تھی مگر جب بھی فرصت ملتی احباب جمع ہوتے اور آپسی گفتگو میں مخدوم سب پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے۔ چاہے وہ امن کمیٹی کا جلسہ ہو یا ترقی پسند مصنفین کی بیٹھکیں، یا سیاسی جلسے، مخدوم ہر ایک کے میر کارواں بنے ہوئے نظر آتے۔

مخدوم کی بزلہ سنجی بڑی مشہور تھی اور جب سیاسی مباحث سے طبیعت [illegible] آجاتی تو مخدوم کوئی نہ کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے کہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل جاتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ جامعہ کا کھلنڈرا مخدوم ہمارے ساتھ ہے۔ مخدوم کے ایک سینیئر ساتھی نے جو بعد میں مخدوم کے ساتھ اسمبلی کے رکن بھی رہے ایک جگہ تحریر کیا ہے۔ کہ مستقر ورنگل پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں حیدرآباد کے شعراء کے علاوہ باہر سے بھی شعرا مدعو تھے۔ مشاعرے سے پہلے ڈنر کا اہتمام تھا۔ ڈنر کے لیے جب بلایا گیا تو مخدوم یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں، باہر چلے گئے۔ کھانا شروع ہوگیا لیکن مخدوم نہیں آئے۔ کافی دیر انتظار کے بعد مخدوم اپنے روایتی تبسم کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیے دوستوں نے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بات ٹال دی۔ مشاعرے میں مائک کے پاس کرسی رکھ دی گئی تھی تاکہ شعراء صاحبان اس پر بیٹھ کر کلام سنائیں۔ جب مخدوم کی باری آئی تو انھوں نے کہا کہ وہ کھڑے ہوکر کلام سنائیں گے۔ غرض وہ مائک کے آگے اپنے دونوں ہاتھ ناف کے پاس باندھے کلام سنانے لگے تو احباب کے علاوہ سامعین کو بھی ان کا یہ پوز سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مشاعرے کے بعد جب صبح کے قریب سب شعرا اور احباب میزبان کے گھر واپس ہوئے تو مخدوم سے ڈنر میں دیر سے آنے اور غیر متوقع پوز کے ساتھ کلام

سنانے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ جب میں پاجامہ باندھ رہا تھا تو کمربند ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا کرتا اس لیے پاجامے کو تہمد کی طرح باندھ لیا۔ مشاعرے میں اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں کرسی سے اٹھتے وقت تہمد کا پیچ ڈھیلا نہ ہو جائے اس لیے میں نے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے اس پیچ کو سہارا دے کر کلام سنا رہا تھا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم کے اس بیان کے بعد محفل کا کیا حال ہوا ہوگا۔

مرزا ظفر الحسن مخدوم کے پرانے ساتھی ہونے کے علاوہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ اس وقت میر حسن اور اشفاق حسین بھی یہیں کام کرتے تھے۔ ایک دن مخدوم نشر گاہ پہنچے اور ظفر الحسن سے کہا کہ "بلاقی" چلیں گے۔ یہ نشر گاہ کے قریب ایک ہوٹل کا نام تھا۔ پورا قافلہ جب چائے ختم کر چکا تو مخدوم نے ظفر الحسن کے سسرال والوں کی تعریف شروع کر دی اس وقت ظفر کے ماموں خسر باٹا کمپنی میں منیجر تھے۔ ظفر نے اس تعریف کے بعد صاف صاف دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو تو مخدوم نے جواب دیا کہ تمہارے سر میں بھیجہ نہیں بلکہ لکڑی کا برادہ بھرا ہوا ہے مجھے جوتے کی ضرورت ہے اور تم فوراً چٹ لکھ دو تاکہ میں وہاں سے جوڑا حاصل کر لوں۔ ظفر الحسن نے چھٹی لکھ دی۔ مخدوم نے چھٹی پڑھی اور کہا کہ باوجود شرافت کے شاید تم نے ایک آدھ بار کسی کنجوس خاتون کا بھی دودھ پیا ہے جب ہی تو تم نے چٹھی میں لکھا ہے کہ ایک جوڑی جوتا لیں گے۔ اگر یہ نہیں لکھتے تو کیا میں پوری دکان اٹھا لیتا۔ ظفر الحسن کو دوسری چٹھی لکھنی پڑی اور تمام احباب ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر مسکرانے لگے۔

مخدوم کی دوستی اور انسانیت کا ذکر نہ ہو تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ میں صرف ایک ہی واقعے پر اکتفا کروں گا۔ حیدرآباد کے ایک بڑے دھن وان راجہ صاحب کے پاس نظام حیدرآباد کے شاہ زادے کی دعوت تھی۔ اس میں مخدوم اور میں بھی مدعو تھے۔ شاہ زادے کے اسٹاف کے ساتھ دو شاعر بھی تھے۔ ان میں سے ایک حیدرآباد کے نامور غزل گو تھے۔ ڈنر سے قبل بنت عنب سے شغل رہا مگر ہماری ٹیبل شاہ زادے اور راجہ صاحب کی ٹیبل سے علاحدہ تھی۔ جب ڈنر ٹیبل پر جانے کا وقت آیا تو

دونوں شاعر وہاں سے کھسکنے لگے۔ مخدوم نے ان دونوں کو دبوچ لیا اور کہا کہ اگر تم سب کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے تو ہم بھی ڈنر میں شریک نہیں ہوں گے۔ قاعدہ یا روایت یہ تھی کہ شاہ زادے کے ساتھ ان کا اسٹاف کھانا نہیں کھا سکتا تھا جب یہ بات راجہ صاحب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے شاہ زادے سے کچھ کھسر پھسر کی اور اس کے بعد ہم سب نے مل کر ساتھ کھانا کھایا جبکہ برسوں سے شاہ زادے کے کھانے کے بعد ان کے اسٹاف کو کھانا ملا کرتا تھا۔ یہ مخدوم کی انسانیت اور دوست نوازی کی ایک معمولی مثال ہے۔

مخدوم صرف ایک شاعر ہی کا نام نہیں بلکہ ایک عہد اور جدوجہد کا بھی نام ہے۔ شاعری ان کا ہتھیار رہی ہے جسے انھوں نے سیاسی جدوجہد کے دوران بطور ہتھیار بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے غم کو سماج کا درد سمجھ کر اور اپنی شاعری کو اس درد سے آشنا کر کے اردو شاعری کو ـــــ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ـــــ نئی فضا سے ہم آہنگ کیا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں اظہار کا جو دلآویز سلیقہ تھا وہ جدید ہوتے ہوئے بھی غزل کی رومانی فضا سے بھرپور تھا اس لیے مخدوم اور ان کے قاری و سامع کے درمیان کبھی فاصلہ حائل نہیں ہوا جو آج کے جدیدیت کے حامی شعراء کے درمیان حائل ہے اور ترسیل و ابلاغ ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کو جن شاعروں اور ادیبوں نے قوت نمو عطا کی ان میں مخدوم کا نام سرفہرست ہے اس تحریک سے ان کی وابستگی اس کے ابتدائی دور ہی سے رہی ہے وہ ایک طرح سے اپنے عہد کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں طبقاتی شعور اور طبقاتی جدوجہد اور سماجی تبدیلی کی بے پایاں خواہش موجزن ہے۔

حسن اگر کائنات کا پہلا حسین تخیل ہے تو عشق وہ امانت ہے جس کی حفاظت کی مخدوم نے ہمت کی اور وہ بھی عمر کے اس منزل پر کہ ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس کا اظہار ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن ان کی غزلوں میں عشق کا اظہار ذہنی بیماری کے طور پر کبھی ظاہر نہیں ہوا بلکہ ایک گہرا سماجی شعور ان کی غزلوں کے پردے میں بھی پنہاں

نظر آتا ہے اور اس شعور کا سنجیدہ اظہار خیال، غزل کی روایات اور نرمی نیز اس کے آہنگ کو مجروح نہیں کرتا۔ مخدوم کی نظموں کی خوبی اور وصف کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ظالموں کو مطعون قرار دیا ہے اس لیے وہ اپنی تخلیقات میں غیر جانب دار نہیں رہے اور انھوں نے ان باتوں کو اظہار کا موضوع بنایا جو حقیقت پر مبنی تھیں اور یہی اعلیٰ شاعری کی بہت بڑی دین ہے۔

مخدوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر کے کبھی اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کیا چاہے حالات کی سختیاں ہوں کہ زندانوں کی بیڑیاں — اور نہ حاکموں کے جبر و ستم کے مقابلے میں اپنی آواز کو کبھی مدھم ہونے دیا یہی ایک بڑے انسان کی خوبی ہے۔ دنیا کے ہر دور میں ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو پیدا ہو کر کبھی مرتے نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ مخدوم بھی ایسے ہی انسانوں میں سے ایک تھے جو محنت کش انسانوں کی جنت بنانے کے جہاد میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور اس کے قافلہ سالار بھی۔ اسی لیے تو انھوں نے دعا مانگی تھی کہ:

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامران ہو کوہکن کی جیت ہو!

پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار

جب میں عمر رفتہ کو آواز دیتا ہوں اور ماضی کی یادوں کے چراغ روشن کرتا ہوں تو مجھے ۱۹۴۴ء کی ایک شام یاد آتی ہے، اس شام ایک ادبی محفل میں جو راجہ بہادر رائے بشیشور ناتھ کے بنگلے پر کوچہ مقرب جنگ (حیدر آباد) میں منعقد ہوئی تھی مجھے پہلی بار پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ان کی تقریر کا موضوع "ہندی شاعری اور چھایا واد" تھا اور انھوں نے بڑے خطیبانہ انداز میں اپنے موضوع پر اظہار خیال کیا تھا۔ میرے دوست جتیندر ناتھ واگھرے نے جب پنڈت جی سے میرا تعارف کرایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی رشی سے مل رہا ہوں۔ یہ ادبی محفل رات کے تقریباً دس بجے برخواست ہوئی۔ پنڈت جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر جب میں باہر نکلا تو ان کے خیالات مجھ پر چھائے ہوئے تھے اور میں ان خیالات کے دھندلکوں میں لپٹا ہوا عابد روڈ پر سے گزر رہا تھا۔ رات کے سایے اگرچہ گہرے ہونے جا رہے تھے مگر ابھی تاریکی نے پوری طرح سے رات کو اپنی آغوش میں نہیں لے لیا تھا۔ اس وقت میں اپنے میں ایک روشنی محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے کوئی بیش بہا چیز پالی ہو۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد مجھے دوبارہ پنڈت جی سے اپنے ایک دوست

اونکار پرشاد کے مکان پر ملنے کا موقع ملا جوان کے قریبی عزیز تھے۔ وہاں ان سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا یہ باتیں ادبی کم اور سیاسی زیادہ تھیں مگر پنڈت جی ہماری باتیں سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے اس وقت مجھے احساس ہوا کہ سیاسیات میں زیادہ دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اطمینان کے ساتھ ہمہ تن متوجہ تھے۔ پنڈت جی کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ اونکار پرشاد کے خالہ زاد بہنوئی ہوتے ہیں انھوں نے ذات پات کے بندھن توڑ کر اورنگ آباد میں شیو پرشاد جی آریہ کی لڑکی سے شادی کی ہے اور کوٹہ میں جنم لینے والے اور گروکل کانگڑی کے فارغ التحصیل پنڈت جی نے حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ "جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن"!!

پنڈت جی سے قریب آنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب میں ۱۹۵۲ء میں ہندی پرچار سبھا کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے لگا تب مجھے ان کی دیو ہیکل شخصیت کا پورے طور پر اندازہ ہوا۔ اس وقت پنڈت جی جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ ہندی کے صدر اور مشہور ہندی ماہنامہ "اجنتا" کے اڈیٹر تھے اور سارے ہندی جگت میں "اجنتا" کی دھوم تھی۔ پولیس ایکشن (۱۹۴۸ء) سے قبل حیدرآباد میں ہندی کا کام کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جامعہ میں ہندی تو کجا دوسری علاقائی زبانوں کی بھی اتنی پوچھ نہیں تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ شعبے تو بنائے جا چکے تھے لیکن درس و تدریس کا کام برائے نام تھا۔ اساتذہ اپنی تنخواہیں پاتے اور جوڑ توڑ میں مصروف رہا کرتے تھے ایسے ماحول میں ہندی کا کام کرنا مشکل تھا۔ پنڈت جی مولوی عبدالحق صاحب کے بہت چہیتے تھے اور انھیں کی ایما پر اورنگ آباد سے حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ میں ہندی اور سنسکرت کے لکچرر مقرر ہوئے تھے اس وقت جامعہ عثمانیہ کی فضا میں جوڑ توڑ، سازش، گٹ بندی کا بہت زور تھا مگر پنڈت جی ہمیشہ اس قسم کی باتوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے شعبے کو مستقل بنیادوں پر استوار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد بھی آسانی کے ساتھ ہندی کا شعبہ قائم نہیں ہو سکا بلکہ اس کے لیے پنڈت جی کو بڑی کوشش اور جدوجہد کرنی پڑی ان کے بعض ساتھیوں نے خود ان کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں

کیں مگر انھوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی. یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لوگوں نے پنڈت جی کی جھوٹی سچی شکایتیں جامعہ کے ارباب اقتدار کے پاس بارہا کیں تاکہ ان کو شعبہ سے ہٹا کر اس پر خود قابض ہو جائیں مگر پنڈت جی نے خاموشی ہی کو اپنا شعار بنایا اور جوابی کارروائی کے طور پر انھوں نے حکامانِ بالا کے پاس کوئی شکایت نہیں کی وہ نہایت ہی سکون کے ساتھ اپنے شعبہ کو وسعت دینے میں مصروف رہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ان نازک حالات میں ایل۔ین۔ گپتا، ڈاکٹر حسین ظہیر اور دوسرے احباب نے ان کی بڑی مدد کی ورنہ آج جامعہ میں ہندی کا شعبہ جس طرح عروج پر ہے اس تک پہنچنے کے لیے اور دیر لگتی۔

پنڈت جی ایک کھاتے پیتے برہمن خاندان میں ۱۹۰۰ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے جو آج پاکستان میں ہے ان کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم آریہ سماجی اصولوں پر ہوئی گروکل کانگڑی سے گرائجوبٹ ہو کر نکلنے کے بعد انھوں نے گجرات کے ایک تعلیمی ادارے میں معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ آریہ سماج کے پرچارک کے ناتے انھوں نے نہ صرف پورے ہندستان کا دورہ کیا بلکہ برما بھی گئے اور تعلیمی اداروں کے لیے چندہ جمع کیا۔ اورنگ آباد بھی وہ اسی غرض سے آئے تھے لیکن وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور مولوی عبدالحق صاحب کی ایما پر حیدرآباد منتقل ہوئے۔ مولوی عبدالحق صاحب سے ان کی پہلی ملاقات کی کہانی بھی بڑی دل چسپ ہے جس کو وہ خود اکثر سنایا کرتے تھے۔

وہ بیان کرتے تھے کہ اورنگ آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور پنڈت جی بھی ایک سامع کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے لیکن کسی نے چپکے سے عبدالحق صاحب کے پاس ایک چٹ بھجوادی کہ یہاں اور ایک نیا شاعر بھی موجود ہے ان سے بھی کو نیا سن لی جائے۔ مولوی صاحب نے پنڈت جی کے نام کا اعلان کر دیا اور جب پنڈت جی اپنی نظم سنا کر ڈائس سے نیچے اترے تو سارا ہال تالیوں کی گونج سے نئے شاعر کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ اس واقعہ سے مولوی صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پنڈت جی کو اورنگ آباد کالج میں استاد کی حیثیت سے مامور کروادیا اور جب وہ صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ منتقل ہوئے تو پنڈت جی کو بھی یہاں بلوایا لیا اور وہ جامعہ میں سنسکرت اور ہندی کے استاد بنادیے گئے۔ پنڈت جی نے

اپنے محسن ڈاکٹر عبدالحق پر "سچا موتی" کے عنوان سے جو مضمون تحریر کیا ہے وہ ہمارے ادب کی ایک یادگار چیز ہے اور خود مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خط کے ذریعہ اپنے قدیم ساتھی غلام ربانی صاحب (مرحوم) کو لکھا تھا کہ "اگر میں والئی ریاست ہوتا تو پنڈت جی کی گود موتیوں سے بھر دیتا۔" تنگ نظر مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بھی پنڈت جی کوئی بڑے مذہبی نہیں تھے۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ وہ مذہب سے بیگانہ یا مذہب دشمن آدمی تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ آزاد خیال تھے اور اپنی رندمشربی کو ہر جگہ اچھالتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی فیاضی دلی کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ ان کی تینوں لڑکیوں نے ذات پات کے بندھن توڑکر اپنی پسند کی شادیاں کیں حتیٰ کہ ان کی ایک لڑکی شاردا نے عبداللطیف بروا (سابق ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو) سے شادی کرلی تب بھی وہ اس میں حائل نہیں ہوئے بلکہ اس کو خوش آمدید کہا۔ اس سے ان کی وسعت قلبی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں جامعہ عثمانیہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۵۶ء میں وہ ایک خانگی ڈگری کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے لگے لیکن تین سال کام کرنے کے بعد انھیں اندازہ ہوگیا کہ وہ اس میدان کے شہسوار نہیں ہیں تو انھوں نے وہاں سے علاحدگی اختیار کرلی اور ہندی اورینٹل کالج کی بنیاد رکھ کر اس کو کھڑا کیا اور مرتے دم تک اس کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پنڈت جی تقریباً (۳۰) سال تک ہندی پرچار سبھا سے وابستہ رہے اور سبھا کی جو بھی مطبوعات شائع ہوئی ہیں ان میں بیشتر ان کی مرتب کردہ یا لکھی ہوئی ہیں اور جب یہ کتابیں شائع ہوتی تھیں تو اس میں نفاست کا وہ خاص خیال رکھتے تھے اور وہ اس امر کی تاکید کردیا کرتے تھے کہ کتاب بہت اچھے کاغذ پر نہایت عمدہ طریقے پر شائع ہو اور اس میں طباعت کی کوئی غلطی نہ رہے۔ ان ہدایات کے باوجود جب کتاب میں غلطیاں رہ جائیں تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہوجاتے تھے۔ کیونکہ پنڈت جی مزاج کی نفاست اور

طبیعت کی شرافت میں اپنی آپ نظیر تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ ان کی تخلیق کے جزو اعظم یہی دو عنصر تھے۔ لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو، قلم بڑھیا ہو، روشنائی کا خاص رنگ ہو اور ان سے بڑھ کر ماحول خوشگوار ہو جب ان کا قلم حرکت میں آتا تھا۔ کتابیں وہ نہایت صاف ستھری رکھتے۔ سکنڈ ہینڈ یا استعمال شدہ کتاب کو وہ "دست غیر سے مس ہو جانے والی دوشیزہ" کا غذی" سمجھتے تھے۔ کھانا عمدہ کھاتے، کپڑا اچھا پہنتے، مکان فرنیچر غرض کہ ہر چیز میں صفائی اور نفاست و لطافت کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ سکنڈ کلاس کوئی سی بھی شئے ہو تو مجھے برداشت نہیں ہوتی ہر چیز فرسٹ کلاس ہونی چاہیے۔ ان میں شرافت نفس اس قدر بھری ہوئی تھی کہ کسی کی دل آزاری کیا دل شکنی بھی نہیں کرتے تھے۔ اپنی تحریروں میں درشت و ناملائم الفاظ کا استعمال وہ گالی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اگر کسی پر چوٹ کرنی بھی ہو تو لطیف اشاروں اور کنایوں کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ تحریریں بھدے اور ثقیل الفاظ کا استعمال کرنا اچھی تحریر کا خون کرنے کے برابر ہے، ان کو شہرت کی کبھی خواہش نہیں رہی اور نہ وہ ان لوگوں سے مرعوب ہوئے جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجتا رہتا تھا بلکہ وہ اس کے قائل تھے کہ:

رموز سجدہ سے نا آشنا ہے میری جبیں

ریاست حیدرآباد میں اور آندھرا اور وشال آندھرا بننے کے بعد مراٹھواڑہ اور کرناٹک میں ہندی پرچار سبھا کے ذریعہ انھوں نے ہندی کی جو سیوا کی ہے اور ہندی کے تعلق سے لوگوں کو جو احساس دلایا ہے ۔ اس کا اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے کہ جنوبی ہند میں ہندی پرچار کی تاریخ ایک کش مکش کی تاریخ ہے، ہنگاموں کی داستان ہے اور ہندی کو جن کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو مشکل مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس وقت تو صرف پنڈت جی کے تعلق سے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندی ہی ان کی دنیا تھی، ہندی ہی ان کی زندگی تھی اور ہندی ہی ان کا نصب العین اور نظریہ حیات تھا۔ اس لیے ہم پنڈت جی کو ہندی

تحریک سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے تو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر پنڈت جی انتی انتھک محبت اور جدو جہد نہ کرتے تو شاید جامعہ عثمانیہ میں ہندی کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو آج اس کو حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو دوسری زبانوں سے محبت نہیں تھی بلکہ وہ تو کئی زبانوں کے عالم تھے اردو اور بنگالی پر تو وہ اچھی خاصی قدرت رکھتے تھے ان زبانوں کے ادب عالیہ کو تو انھوں نے ہندی میں منتقل کیا ہے گرودیو ٹیگور اور مولانا حالی ان کے خاص اور پسندیدہ شاعر تھے جن کے بے شمار اشعار ان کو ازبر تھے۔

پنڈت جی کی اردو دوستی کا اندازہ ہم ان کی اس تقریر سے لگا سکتے ہیں جو انھوں نے "یوم اردو" کے موقع پر ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو اردو ہال میں کی تھی۔ اردو والوں سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اردو کی راہ میں آج کل جو دشواریاں اور مشکلات حائل کی جارہی ہیں ان سے اردو والوں کو بددل نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں تو اپنی مساعی میں اور زیادہ انہماک سے کام لینا چاہیے ان کا خیال تھا کہ ہندی "ہندستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اور اگر اسے ہندستان گیر ہونا ہے تو وہ اردو کی مدد اور شریک کار کی حیثیت ہی سے اس درجے اور مقام کو پہنچ سکتی ہے اس لیے ہندی اور اردو میں رقابت اور دشمنی نہیں ہونی چاہیے" ایک جگہ انھوں نے اردو ادب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "اردو کا ادب سرل ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اس کا خزانہ بھرپور ہے جس میں موتی، ہیرا، یاقوت اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے جواہرات ہیں ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا تاکہ ہندی کا روپ نکھر سکے"

پنڈت ونشی دھر جی کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا اور یہ نام کچھ اس طرح سے دل و دماغ میں رچ بس گیا تھا جیسے کسی رشی منی کا نام ذہن نشین ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ

پنڈت جی پر جب لکھنے بیٹھا تو بات میں بات نکلتی چلی گئی اور میں خطرہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید میں اپنے فرض کو پورا نہ کر سکوں۔ آج پنڈت جی ہم میں نہیں ہیں لیکن میرے لیے ۲۲ر فروری ۱۹۶۶ء کے بعد بھی یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ اب وہ ہماری سماج اور زمانے کے نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موت نے انھیں ہمارے درمیان سے جدا کر کے غلطی ہی کی ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے !!

ڈاکٹر رادھا کرشنن ـــــ زندگی اور عمل!!

شکسپیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "وہ اتنا رحم دل ہے کہ اسے خالق کی تمام خوبیوں کا حاصل کہا جاسکتا ہے اور اس کی سیرت سے عیاں ہے کہ وہ ایک سچا انسان ہے۔" اور یہ بات شروتنی گاؤں میں ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء کو ایک متوسط برہمن خاندان میں پیدا ہونے والے رادھا کرشنن پر صادق آتی ہے۔ انھوں نے ۱۲ مئی ۱۹۶۲ء کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تھا۔ انھیں دنیا ایک بڑے مفکر، فلسفی، ادیب اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کر چکی ہے، ہندستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے لیے صدارتی کرسی خالی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دنیا کی تاریخ میں یہ ایک یادگار واقعہ ہے کہ صرف کرسی کے بدلنے سے اقتدار کی منتقلی کا کام مکمل ہوگیا۔"

ہندستان کا پہلا صدر جمہوریہ ایک سیدھا سادہ انسان تھا تو دوسرا صدر ایک بڑا فلسفی تھا اور فیلسوف بھی ایسا کہ تمام دنیا سے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا اور استالن جیسے سربراہ کو بھی رادھا کرشنن سے ملاقات کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ "یہ تنگ نظر محب وطن نہیں ہے بلکہ دکھی انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔" ۵ اپریل ۱۹۵۲ء کو

روسی وزیر خارجہ وشنسکی نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے اعزاز میں ایک وداعی پارٹی ترتیب دی تھی جب وہ سفیر کی حیثیت سے ماسکو سے روانہ ہو رہے تھے۔ وشنسکی نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سہولت کا خیال کرتے ہوئے انھیں رات کے کھانے کے بجائے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر وشنسکی نے ڈاکٹر رادھا کرشنن سے کہا کہ استالن آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ اس وقت رادھا کرشنن کی ہندستان کو روانگی کے لیے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ اس لیے اسی رات کو دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مسٹر پاولاف جو روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے —— مترجم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "استالن کا چہرا سوجا ہوا تھا اور میں نے ان کے گالوں پر ہاتھ پھیرا، پیٹھ تھپتھپائی اور اپنا ہاتھ ان کے گلے میں ڈال دیا۔" اس پر استالن نے کہا کہ "آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھے انسان سمجھ کر برتاؤ کیا ہے۔ آپ ہم کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کی درازی عمر کا خواہش مند ہوں۔ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گا۔" اس کے چھ مہینے بعد ہی استالن کا انتقال ہو گیا۔ جب ڈاکٹر رادھا کرشنن، استالن سے رخصتی مصافحہ کر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ استالن کی آنکھیں چھلک رہی ہیں۔ یہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے انسان دوستی کی معراج تھی اسی لیے وہ جہاں بھی گئے کامیاب ثابت ہوئے۔

۱۹۰۸ء میں بیس سال کی عمر میں ڈاکٹر رادھا کرشنن معلمی کے پیشے سے منسلک ہوئے اور پریسیڈنسی کالج، مدراس میں فلسفہ اور منطق کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے اس پیشہ کو اپنایا جب کہ وہ ہنوز ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ معلم کی حیثیت سے نوجوان رادھا کرشنن کی شہرت کالج کی دیواروں کو پار کرتے ہوئے دور دور تک پھیل رہی تھی۔ ان کے لکچروں میں زبان و بیان کا ایک ایسا جادو تھا کہ ان کے کلاس روم سے باہر جانے کے بعد بھی طلبا اس جادو کے چنگل سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اپنے طالب علموں کی مدد کرنا ان کی عادت میں شامل تھا۔ چناں چہ کلکتہ یونی ورسٹی کے ایک طالب علم نے ان کو اس وقت خط لکھا تھا جب کہ وہ نائب صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز تھے اور

کبھی کبھار کلکتہ یونیورسٹی میں لکچر دینے کے لیے جایا کرتے تھے۔ طالب علم لکھتا ہے کہ "بہت ہی غریب ہونے کی وجہ سے میں آپ کی تصنیف "انڈین فلاسفی" خرید نہیں سکتا اس لیے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ عاریتاً اس کی جلدیں بھجوادیں، میں ان کو امتحان کے ختم ہونے کے بعد واپس کردوں گا۔" انھوں نے طالب علم کی مشکل کو محسوس کرلیا اور کتابیں روانہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ان کتابوں کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" بحیثیت معلم انھوں نے کس کس کی مدد کی ہے اس کا کوئی لیکھا جوکھا موجود نہیں ہے لیکن مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے ان کی اس عادت کو بڑا سراہا ہے۔

مدراس کے بعد انھوں نے میسور یونی ورسٹی میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی تین سال گزارے اور یہ جب وہاں سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو میسور کے ریلوے اسٹیشن پر انھیں رخصت کرنے کے لیے اتنا بڑا ہجوم تھا کہ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کلکتہ میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنے طور طریق نہیں بدلے اور نہ ان کے معمولات میں کوئی فرق آیا۔ ۱۹۱۶ء میں آندھرا یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا اور یہ ہنوز صرف امتحان لینے والی جامعہ تھی۔ ۱۹۳۱ء میں آندھرا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے جب ان کا انتخاب عمل میں آیا تو جامعہ کی جماعتیں کرایہ کی عمارتوں میں چلائی جارہی تھیں اور تدریس کے لیے بھی کسی مستقل عملے کی تعیناتی عمل میں نہیں آئی تھی۔ مگر ان کی کوششوں سے نہ صرف جامعہ کی مستقل عمارتیں تعمیر ہوئیں بلکہ ہندستان بھر سے قابل اساتذہ کو مامور کیا گیا جن میں سر جہانگیر جی کو یا، پروفیسر ہیرن مکرجی، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر ننکا سندرم، ڈاکٹر یس بھگونتم، ڈاکٹر شیشا دری اور ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ کے نام نمایاں اور قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ آندھرا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے ہوئے کلکتہ یونی ورسٹی کے بھی پروفیسر تھے۔ ایسا اعزاز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ اسی دوران میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے بے حد اصرار پر انھوں نے ہندو یونی ورسٹی، بنارس کے اعزازی وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنا کام شروع کردیا اور آندھرا یونی ورسٹی سے اپنا تعلق منقطع کرکے ہفتے میں دوبار کلکتہ سے بنارس جانے اور

وہاں کا کام نپٹا کر واپس کلکتہ آجاتے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن شاید اکیلے ایسے پروفیسر تھے جو کلکتہ یونی ورسٹی کے پروفیسر ہوتے کے علاوہ آکسفورڈ میں EASTERN REIGION کی اسپالڈنگ چیر کے بھی پروفیسر تھے اور ہندو یونی ورسٹی بنارس کے وائس چانسلر بھی! تقریباً بیس سال تک کلکتہ یونی ورسٹی سے وابستہ رہنے کے بعد انھوں نے ۱۹۴۱ء میں وہاں سے استعفیٰ دیدیا اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک بحیثیت وائس چانسلر ہندو یونی ورسٹی کی جو خدمت انجام دی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جب ہندوستان قیدِ غلامی میں تھا تب ایک ہندوستانی کے نام کے آگے کسی بھی یورو پین یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہ ہونے کے باوجود انھیں آکسفورڈ میں پروفیسر بنایا گیا جو ہندوستان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

بظاہر ہندوستان کی تحریک آزادی میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کا کوئی عملی حصہ نظر نہیں آتا ہے لیکن ان جیسی شخصیت کے لیے سیاسیات سے دور رہنا بھی ممکن نہیں تھا اور انھوں نے اس کے لیے اپنا قلم استعمال کیا اور ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی ۷۱ ویں سالگرہ کے موقع پر جو کتاب ان کے تعلق سے پیش کی گئی وہ تحریک آزادی کا ایک یادگار تحفہ ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن سے گاندھی جی کی پہلی ملاقات بھی بہت ہی دلچسپ انداز میں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد مدراس میں اپنے ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھے تو نوجوان رادھا کرشنن ان سے ملنے گئے اور جب یہ دودھ پی رہے تھے تو گاندھی جی نے کہا کہ "دودھ مت پیو یہ تو گائے کے گوشت کا حاصل ہے" نوجوان پروفیسر نے اسی وقت جواب دیا کہ "ایسی صورت میں تو ہم انسان کا گوشت بھی کھاتے ہیں اس لیے کہ ہم ماں کا دودھ پیتے ہیں"۔ گاندھی جی کو یہ جملہ سن کر خاموش ہوجانا پڑا۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۸ء تک یعنی تقریباً چالیس سال تک انھوں نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری اور دنیا میں معلمی کے پیشے کو اونچا کر دکھایا۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں تعلیمی کمیشن کا صدر بنایا تاکہ ان کے تجربہ

سے نئے ہندستان کے تعلیمی میدان میں فائدہ اٹھایا جاسکے۔یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن ڈاکٹر رادھا کرشنن ہی کی سفارش سے قائم ہوا تاکہ ہندستانی جامعات کی حالت کو ٹھیک اور درست کیا جاسکے اور ان کی ترقی کے لیے مالی امداد کا بھی انتظام ہوسکے۔ یونسکو UNESCO کے چیرمین کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر تعلیم اور ثقافتی میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ہندستانی ساہتیہ اکادمی کا قیام اور اس کے ذریعہ ہندستانی زبانوں کے ادب کو ایک دوسرے سے قریب لاتے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے اور ایک دوسرے کے ادبی سرمایہ کو سمجھنے میں جو مدد ملی ہے اس کو کسی طرح سے بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

بحیثیت سفیر کے میں عرض کرچکا ہوں کہ اسٹالن جیسے شخص نے ان کی تعریف کی اور اس کی وجہ سے ہند، روس دوستی کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد ملی اور اس کے بعد آنے والے سالوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی میں روس نے جو مدد دی وہ ڈاکٹر رادھا کرشنن ہی کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے یہ راجیہ سبھا کے چیرمین بھی رہے اور یہ وہ دور تھا جب کہ پارلیمانی جمہوریت کا ہمارے ملک میں آغاز ہوا تھا لیکن آج بھی اس دور کو لوگ یاد کرتے ہیں کہ بحیثیت صدر راجیہ سبھا انھوں نے جو روایات قائم کیں وہ بقول شری بھوپیش گپتا کہ "ہماری پارلیمانی زندگی کا ایک جز بن چکی ہیں۔"

صدر جمہوریہ کی حیثیت سے انھوں نے ملک ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر امن کی برقراری اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جو نمایاں کام انجام دئے ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انسانیت کے تابناک مستقبل کے بارے میں کبھی ناامیدی کا اظہار نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس کو سنوارنے میں پورے انہماک سے کام لیا اور بتایا کہ ہماری دھرتی ہی ہماری جنّت ہے اسی لیے آج ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خاک کے پردے سے انسان جنم لیتے ہیں اور ایسے انسانوں میں سے ایک کا نام ڈاکٹر رادھا کرشنن ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا تعلق ہمارے ملک کے ان قائدین کی نسل سے ہے جو اب ناپید ہو چکی ہے اور اب وہ لوگ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں جنھوں نے گاندھی جی کے بعد راجندر پرشاد اور اسی قبیل کے دوسرے قائدین کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کے شانہ بہ شانہ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا تعلق اس نسل سے بھی تھا جس نے گاندھی جی کے حلقۂ اثر میں آجانے کے بعد عیش و عشرت کی زندگی کو خیر باد کہہ کر سادگی پسندی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ وہ اس قدر سادہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے کہ جب ۱۹۳۴ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا تو وہ شاہی مہمان تھے۔ گاندھی جی کے لیے تو ان کی مقررہ غذا فراہم کردی گئی لیکن راجندر پرشاد یا راجن بابو اور ان کے ساتھیوں کے لیے شاہی آداب کے مطابق چاندی کے برتنوں میں پورے لوازمات کے ساتھ چکنائی سے بھرپور کھانا پروسا گیا۔ جب گاندھی جی کو کسی طرح سے اس کی اطلاع ملی کہ راجن بابو اور ان کے دیگر ساتھیوں کو ایسی غذا سربراہ کی جارہی ہے جو ان کے لیے ناقابل ہضم ہے تو انھوں نے ایوان شاہی میں کہلا بھیجا کہ میرے ساتھیوں کو بھی وہی غذا فراہم کی جائے جو ان کے لیے

پکتی ہے اس سے ان کی سادہ زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پیدائش ۳ر دسمبر ۱۸۸۴ء کو بہار کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ اس گاؤں کو ان کے دادا نے یو۔ پی سے آکر خرید لیا تھا اور یہیں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ کائستھ خاندانوں میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے راج دربار میں بھی ان کو بڑا مقام ملنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راجن بابو کے دادا منشی چودھر لال تقریباً چوتھائی صدی تک ریاست ہتھورا کے دیوان بھی رہے اور بڑا نام کمایا۔

راجن بابو کے والد منشی مہادیو سہائے بڑے ملنسار اور پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے حالانکہ انھوں نے حکمت کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن تجربے کی بناء پر انھوں نے اس پیشے میں بڑا نام کمایا۔ وہ غریبوں کا مفت علاج کرتے تھے اور صاحب ثروت افراد سے فیس اور دوا کے پیسے لیا کرتے تھے وہ اپنے گاؤں میں اتنے با اثر تھے کہ گاؤں کے مقدمات عدالت میں جانے کے بجائے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہ جو تصفیہ کرتے فریقین کے لیے قابل قبول ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راجن بابو کو بھی اپنے گھر کا یہ ماحول دیکھ کر وکیل بننے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ اپنی زندگی میں اتنے بڑے وکیل بنے کہ لندن کی پریوی کونسل میں تک انھوں نے ایک مقدمے کی پیروی کی۔

راجن بابو اپنے والد کی پانچویں اور آخری سنتان تھی ان کی ابتدائی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق ہوئی۔ چنانچہ وہ اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں اس تعلق سے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانے کے مروجہ رسم کے مطابق بسم اللہ مولوی صاحب نے کرائی تھی۔ جس دن تعلیم شروع ہوئی، حرف شناسی کی ابتداء بسم اللہ سے ہوئی۔ شیرنی بانٹی گئی اور مولوی صاحب کو روپیے بھی دیے گئے۔" یہ ان کی تعلیم کی ابتدا تھی اور انتہا اس وقت ہوئی جب انھوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی کرنے کے بعد وکالت کے دوران ایم۔ ایل کا امتحان پاس کیا۔ یہ پہلے بہاری تھے جنھوں نے یہ امتحان کامیاب کیا تھا۔

راجن بابو ابتدا ہی سے بڑے شرمیلے اور جھینپو قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ وہ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ " میں بچپن میں بڑا دبو رہا ہوں اور کسی بڑے معاملے میں فوری فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی " لیکن زندگی میں ایک منزل ایسی بھی آئی کہ جب گوپال کرشن گوکھلے نے انھیں سروینٹ آف انڈیا سوسائٹی SERVANT OF INDIA SOCIETY میں شرکت کی دعوت دی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ یہ ان کی عوامی زندگی کی ابتدا تھی اور وہ اس سوسائٹی کے رکن اس لیے بھی بنے کہ ملک کی کچھ خدمت کر سکیں۔ وکالت کے ساتھ ساتھ انھوں نے پیشۂ تدریس کو بھی اپنایا تھا۔ کلکتہ اور بہار کے ایک کالج میں وہ لکچرار کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگے تھے۔ لیکن جب گاندھی جی نے بائیکاٹ کا آندولن شروع کیا تو انھوں نے نہ صرف وکالت ترک کردی بلکہ پیشۂ تدریس سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی اور اس کے بعد عوامی خدمت ہی کو انھوں نے بقیہ زندگی میں اپنا شعار بنا لیا۔ گاندھی جی نے جب جنوبی افریقہ سے لوٹ کر ہندستانی سیاست میں قدم رکھا تو اس وقت پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں نے وعدہ خلافی کر کے ہندستان میں اصلاحات کے نفاذ کے بجائے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا جس کی وجہ سے پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا اور سیاسی شورش بپا ہو گئی۔ سامراجیوں نے ہندستانی قوم پر اتنے ظلم ڈھائے کہ ہندستانیوں کے دلوں میں بھی انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ لیکن گاندھی جی کی قیادت نے اس کو انقلابی صورت اختیار کرنے نہیں دیا اور عدم تشدد پر کاربند رہنے کی ملک والوں کو تلقین کی۔ اس تلقین کا راجن بابو پر اتنا اثر پڑا کہ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ " گاندھی جی نے نامناسب برتاؤ کو ہمیشہ غلط بتایا کیونکہ اس سے ایک تو سچی کامیابی نہیں ہو سکتی اور اگر کامیابی قسم کی کوئی چیز نظر بھی آئی تو وہ اس مقصد کی کامیابی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے غلط عمل کی وجہ سے وہ مقصد ہی بدل جاتا ہے جس کے لیے ہم جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے سچ اور اہنسا کی پابندی ہر حالت میں اور ہر موقع کے لیے ضروری اور لازمی بتائی "

۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۶ء تک ملک میں جو سیاسی تحریکیں چلیں ان سب میں راجن بابو نے عملی طور پر حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں۔ یہ تین بار یعنی ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے یہ وہ ادوار ہیں جب ہمارے ملک میں سیاسی طور پر جو بڑی تحریکیں چلیں ان میں میں راجن بابو نے حصہ لیا اور کامیابی سے ہمکنار رہے۔

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو ہندستان میں ایک عارضی قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں مسلم لیگ نے پہلے تو شرکت نہیں کی اس لیے کانگریس نے یہ حکومت بنائی لیکن بعد میں لیگ کو بھی اس عارضی حکومت میں شریک ہونا پڑا۔ اس عارضی حکومت میں راجن بابو ملک کے وزیر زراعت و اغذیہ تھے۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو راجن بابو اس کے صدر بنائے گئے اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور کی منظوری کے بعد ہمارا ملک جمہوری ہندستان میں تبدیل ہوا تو یہ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہونے پر مسز سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مجھ سے کچھ لوگوں نے خواہش کی کہ اس موقع پر میں کوئی رزمیہ نظم لکھوں تاکہ راجن بابو کی خدمت میں اسے پیش کیا جاسکے۔ تو میں نے اپنے دل سے کہا کہ اگر میرا قلم سونے کا بھی ہو اور میں اسے شہد بھری دوات میں ڈبو کر بھی نظم لکھنا چاہوں تب بھی میں ان خوبیوں کو اجاگر نہیں کرسکتی جو راجن بابو کا وصف رہی ہیں"۔ اس موقع پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو تقریر کی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب بن چکی ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو راجن بابو جمہوریہ ہند کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور پورے بارہ سال تک انھوں نے بحیثیت صدر جمہوریہ ملک کی جو خدمت اور اس کے نام کو ساری دنیا میں جس طرح سے روشن کیا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ناقابل بیان ہے۔ ۱۹۶۲ء میں صدارت کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد پٹنہ کے صداقت آشرم میں سکونت اختیار کی اور ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء کو انھوں نے آخری سانس لی اور

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔

راجن بابو صرف سیاست داں ہی نہیں تھے بلکہ ان میں بحیثیت ادیب وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک ادیب میں ہونی چاہیے۔ ابتدا ہی سے ان کو ادب اور شاعری سے دلچسپی رہی تھی اور جن لوگوں نے ان کی خودنوشتہ سوانح عمری پڑھی ہے جو ہندی میں لکھی گئی تھی وہ ان کے ادبی ذوق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سردار پٹیل جیسے شخص نے اس سوانح حیات کے بارے میں لکھا تھا کہ "اس کے ہر صفحہ پر راجن بابو کی زندگی کی ملائمت کے نقوش ملتے ہیں۔ یہ ہماری سیاسی زندگی کی تیس سال کی ایک طرح سے مستند تاریخ ہے اور سیاسیات کا کوئی بھی طالب علم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا"

آخر میں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ راجن بابو کی صدارت کے زمانے میں جواہر لال نہرو ہندستان کے وزیر اعظم تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا ایک بھڑکنے والا شعلہ تھا تو دوسرا دھیمی اور مدھم آنچ تھی لیکن ان دونوں نے مل کر جس خوبی کے ساتھ ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور دنیا میں ہندستان کے نام کو روشن کیا وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

محمد شہاب الدین

محمد شہاب الدین پر لکھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ چار دہوں سے اوپر ہو گئے ہم ایک دوسرے کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ ہماری شناسائی گہری دوستی میں بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ میرے لیے نہ صرف دوست تھے بلکہ ایک طرح سے استاد بھی تھے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو میں شہاب سے پہلی بار مسز نائیڈو کے گھر پر ۱۹۴۰ء میں ملا تھا جب کہ کامریڈز ایسوسی ایشن کا ایک وفد انھیں وداع کرنے آیا تھا اس لیے کہ وہ سنتیہ گرہ کرنے جا رہی تھیں اور ان کی صاحبزادی مس پدمجا نائیڈو کو مدعو کرنا تھا کہ وہ "یوم مخالف فسطائیت" میں نہ صرف شریک ہوں بلکہ اپنی تقریر سے بھی نوازیں۔ اس وقت کی ایک یادگار تصویر (ڈاکٹر) راج بہادر گوڑ کے پاس محفوظ ہے جس میں شہاب کے علاوہ دوسرے کامریڈز بھی شامل ہیں۔ راج بہادر اس وقت کلیہ طبیہ جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے۔ دوسری بار شہاب سے ہماری ملاقات اسٹوڈنٹ یونین کے دفتر واقع قطبی گوڑہ میں ہوئی جہاں وہ طلبا اور نوجوانوں کی کلاس لیا کرتے تھے۔ وہ جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کا درس دیا کرتے تھے۔ اس وقت کے ہمارے سیاسی استادوں میں (پروفیسر) حامد علی قادری جو پیشے کے اعتبار سے انجینیر تھے لیکن وہ طبعیات سے لے کر تصوف تک اور غالب سے لے کر

مخدوم تک اُردو شاعری کے ماہر مانے جاتے تھے۔ نیز چینی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی اس وقت ایک کتاب کا بڑا چرچا تھا وہ کتاب مسز نیم ویلز کی تصنیف کردہ تھی جس کا عنوان تھا " چین کی معاشی تنظیم جدید " اور اس کا خلاصہ حامد علی قادری کے ذمہ تھا۔ اس کے علاوہ مرزا محمد باقر خاں جو بعد میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائرکٹر بنے وہ معاشیات کی کلاس لیا کرتے تھے۔ اس وقت کے ہمارے سیاسی استادوں میں اگر کوئی واقعی پروفیسر دکھائی دیتا تھا وہ شہاب الدین تھے۔ جو ہمیشہ ٹپ ٹاپ (TIPTOP) رہتے تھے جن حضرات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ جامعہ عثمانیہ کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کا جھکاؤ بائیں بازو کی تحریکوں سے تھا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں جن لوگوں نے کامریڈز ایسوسی ایشن کو سنوارا، پروان چڑھایا اور کمیونسٹ پارٹی کی نیو رکھی ان میں شہاب الدین بھی شامل تھے۔ یہ غالباً ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں کمیونسٹ پارٹی کا جو دوسرا پارٹی سل حیدرآباد میں بنا اس کے سکریٹری بھی چنے گئے تھے۔ اس قافلہ میں اس وقت مخدوم کے علاوہ راج بہادر، کلیم اللہ، غلام حیدر، جواد رضوی اونکار پرشاد، راجیہ عالم خوندمیری، مرزا حیدر حسین، سید ابراہیم اور بہت سے دوسرے نام ہیں جنھوں نے بائیں بازو کی تحریکوں کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنا پڑی اور مسز سروجنی نائیڈو کی سرپرستی اور قاضی عبدالغفار کی رہنمائی میں انجمن کا قیام عمل میں آیا اور اس کے پہلے معتمد عابد علی خاں منتخب ہوئے یہ بات ۱۹۴۲ء کی ہے اس تحریک کی نیو رکھنے اور اس کے نشو نما میں شہاب کا بھی حصہ رہا ہے۔ حالانکہ انھوں نے لکھنے کے بجائے مطالعہ کو پیشے کے طور پر اپنایا تھا۔ ان کی تحریر کردہ کوئی چیز دستیاب ہو سکتی ہے تو وہ ان کے ایم۔ اے کا مقالہ ہے جس پر آصف سابع کا عتاب نازل ہوا تھا اسی لیے وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس مقالے میں انھوں نے ریاست حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دو ترجمہ کردہ کتابیں جدلیاتی اور تاریخی مادیت پر ہیں جو بمبئی سے پیپلز پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی تھیں جواب دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس زمانے

میں یہ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں بھی کام کرتے تھے۔

ریاست حیدرآباد کے ملازم سرکار ہوتے ہوئے بھی شہاب نے بائیں بازو کی تحریکوں میں جو حصہ لیا ہے وہ اب تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے۔ انھوں نے محکمۂ امور سیاسی میں ملازمت اختیار کی اور جب ریاست میں رضا کاروں کا دور شروع ہوا اور لائق علی صدر اعظم بنائے گئے یہ اس وقت ورنگل میں پبلک ریلیشن آفیسر کے عہدے پر مامور تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ انھوں نے کچھ ہی دنوں بعد سیاسی حالات سے تنگ آکر ملازمت سے استعفی دیدیا۔ ان کی مختصر مدت کی ملازمت تھی اسی مناسبت سے انھیں وظیفہ ملا۔ مگر ان کے ٹھاٹ ایسے تھے کہ کوئی دو ہزار کمانے والا بھی نہیں کر سکے گا۔ بہترین شیروانی اور سوٹ، بڑھیا جوتا اور موزے اور نفاست پسندی اس قدر کہ تمام احباب عش عش کیا کرتے تھے۔ احباب میں بھی بہت سوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ شہاب بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے اور اسی لیے انھیں احباب "ٹونٹا شہاب" کے لقب سے نوازا کرتے تھے۔ شہاب اور شہاب کے ہم عصر عثمانین دوستوں کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا ظفرالحسن نے اپنی کتاب "ذکر یار چلے" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے دوستوں میں ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی جادو تھا۔ میفسٹو کا علم میر حسن کی فحاشیات، اشفاق کی گالی، مخدوم کا شعر، وجد کا لحن مہاجر کی تقریر، یحییٰ کا خلوص، مجید کا پیار، ساز کی خموشی، عباس کی صورت، علی کی قلندری، شہریار کی پرگوئی، غلام علی کا مسخرہ پن، روف کا سُر، عاقل کی زود نویسی، وہاب کا طنز، شوکت کی شوخی، غوث کی اصول پسندی، جمیل کی الکشن بازی غرض ہر ایک اپنے مقناطیس سے ہمیں اپنی طرف کھینچتا تھا مگر آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ شہاب کے پاس کونسا جادو تھا، نہ ڈرامے لکھے نہ تقریر کرے نہ شعر سنائے اور نہ گائے، مخدوم سے زیادہ تنک مزاج، اور میر حسن سے زیادہ غصیلا اگر کوئی بات ذرا اس کی مرضی کے خلاف ہوئی اور اس نے سات پشتوں کو جاہل قرار دیدیا۔ نہ اپنی کہے گا نہ دوسرے کی سنے گا۔ ان تمام باتوں کے باوجود شہاب میں کوئی جوہر قابل تھا جو دکھائی نہیں دیا۔ محسوس نہیں ہوا مگر اس

میں تھا" اور یہی جوہر اسے دوسروں سے منفرد بنا دیتا تھا۔

شہاب نے شادی نہیں کی لیکن ایک معشوقہ ہمیشہ ان کی بغل میں رہا کرتی تھی اور وہ ان کی ٹکسی سیکل تھی۔ اس وقت درجہ اول کی سیکل کا ماہانہ کرایہ دس روپے ہوا کرتا تھا۔ مگر اس زمانے میں بھی شہاب کی سیکل سے بہتر تو کجا اس کے برابر بھی کسی کی سیکل نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب ان کی سیکل بعض مخصوص مقامات پر کھو جاتی تو مرحوم کو بڑا غم ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ سیکل کی گمشدگی کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور وہ اس طرح کہ شہاب مرحوم عام طور پر ویکاجی ہوٹل میں شغل فرمایا کرتے تھے اور یہاں کی بیٹھک سے ان کے دوست اور دشمن دونوں ہی واقف تھے۔ ایک سارق نے جو کئی دنوں سے ان کی سیکل کی تاک میں تھا۔ ایک روز جب یہ سیکل کھڑا کر کے ویکاجی کی "بکوں" میں جا کر اس طرح بیٹھے کہ سیکل پر ان کی نظر رہے انھوں نے دیکھا ایک شخص آیا سیکل کو اسٹانڈ سے اتارا، اور اس پر سوار ہو کر چلتا بنا۔ اس پر شہاب چلانے لگا کہ چور میری سیکل لے جا رہا ہے لیکن چور اس قدر سینہ زور تھا کہ اس نے شہاب کو جاتے ہوئے ایک موٹی سی گالی دی اور پکار کر کہا کہ چلاتا کیوں ہے ابھی واپس لے آؤں گا۔ اس پر پولیس کا جو جوان وہاں کھڑا تھا اس نے سمجھا کہ یہ ان کا دوست ہے اور ضرورت سے سیکل لے جا رہا ہے۔ یہ سمجھ کر وہ خاموش رہا۔ جب شہاب نے پولیس تھانے میں سیکل کے سرقہ ہو جانے کی رپورٹ لکھوائی تو وہی جوان کہنے لگا کہ صاحب! وہ تو آپ کا دوست تھا جو گالی دیکر سیکل لے جا رہا تھا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس پر شہاب کو خاموش ہو جانا پڑا۔ اس زمانے میں اس کے تمام احباب مل کر بھی اس سرقہ شدہ نئی سیکل کی قیمت ادا نہیں کر سکتے تھے اور نہ شہاب میں اکیلے ہی اس کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت تھی اس کے باوجود شہاب نے پہلی سیکل کی قیمت ادا کرنے کے بجائے ماہانہ قسط مقرر کر کے دوسری نئی سیکل کرایے پر لے لی۔

شہاب زندگی میں اس بات کا قائل رہا کہ کام آرام سے کرنا چاہیئے جلد بازی صحت کو خراب کر دیتی ہے اور وہ اس اصول پر عمر بھر عمل پیرا رہا۔ اسی لیے تو ان کی صحت پر برسوں کوئی اثر نہیں پڑا۔ چناں چہ سبط حسن نے اپنی کتاب "شہر نگاراں" میں لکھتے ہیں کہ

"جب وہ (۳۵) سال بعد ۸۲ ۱۹ء میں ان سے ملے تو شہاب میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تن و توش میں نہ عادات و اطوار میں۔ وہی بوٹا سا مائل بہ فربہی قد، وہی سر کے سیاہ بال اور چہرے پر وہی بے فکری اور شادابی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ دولت و ثروت کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لایا، بال بچوں کا جھمیلا کبھی نہیں پالا کہ اس سے اس کی آزادی میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا۔"

کتابیں جمع کرنا، کتابیں پڑھنا، عمدہ شراب پینا اور اچھا کھانا اس کے محبوب مشاغل تھے وہ ان دیرینہ مشاغل کو پوری وضعداری کے ساتھ نبھاتا رہا لیکن زندگی کے آخری دور میں اس کو ایک ایسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا کہ اس سے نجات ممکن نہیں تھی حالانکہ دو سال قبل آپریشن ہوا تھا اور احباب کو آس بندھی تھی کہ وہ اب اچھا ہو جائے گا لیکن احباب کی یہ آس نراس میں تبدیل ہو گئی اور وہ راج بہادر، نرسنگ راؤ پرانجپے بابیا نائیڈو، شنکر میلکوٹے اور لاہوتی کو چھوڑ کر خود روتا ہوا اور احباب کو رلاتا ہوا (۷۷) سال کی عمر میں یکم ستمبر ۸۵ ۱۹ء کو ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا اب صرف اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔

"نرالا" کی شخصیت اور شاعری

نرالا کی موت ہماری بے رحم سماج کا ایک المیہ ہے۔ سوکھی ٹہنی کو دیکھ کر ہم سب لوگ بسورتے ہیں اور جب گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ کر مٹی میں مل جاتی ہیں تو اسماج اس کی خوشبو کو تلاش کرتا ہے۔ لیکن جب وہی گلاب کا پھول ٹہنی پر ہے تو کوئی بھی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ کیا وہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا نہیں رہا ہے۔ مگر جب وہ ٹہنی سے جدا ہو جاتا ہے تو سب لوگ اس کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ہماری سماج کا یہ دستور اتنا نرالا ہے جتنا کہ خود شاعر اپنی زندگی سے نرالا رہا۔

پورے ہندستانی ادب کا جائزہ لیا جائے تو چند ہی ایسے نام ہمارے سامنے آئیں گے جنھوں نے ہمارے ادب کے دھارے کو موڑنے میں مدد دی ہے۔ ان میں سے "سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا" کا بھی ایک نام ہے۔ آج سے تقریباً نوّے سال پہلے سمت ۱۹۵۳ بسنت پنچمی یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء) یو۔ پی کے ایک برہمن خاندان میں "نرالا" پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے باغیانہ خیالات رکھنے کی وجہ سے انھیں کم عمری ہی میں گھر بار چھوڑ دینا پڑا اور انھوں نے قلم کے ذریعہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے

کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

نرالا کو ہندستان کے ماضی سے اتنا پیار تھا کہ وہ اس کی شاندار روایات کے سہارے حال کو ناآسودگیوں سے محفوظ رکھ کر مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس میں ان کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ تو ادبی مورخ پر چھوڑتا ہوں ــــ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ کسی شاعر کا دوسرے شاعر سے مقابلہ کیا جائے اور ایک پر دوسرے کو فوقیت دی جائے۔ لیکن اگر ہم انگریزی زبان کے تین بڑے شعرا کیٹس، شیلی اور بائرن کی مشترکہ شاعرانہ روایات کا پرتو کسی ایک شاعر میں دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ہی ہیں۔ ان کی شاعری میں کیٹس (KEATS) کی طرح ماضی کی یادیں شیلی (SHELLY) کی طرح مستقبل کی خواب آفرینیاں اور بائرن (BYRON) کی طرح حال کی ناآسودگیاں مشترکہ طور پر جلوہ نما ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو نیا آہنگ ملا اور شاعری کی آواز کبھی بے اثر نہیں ہونے پائی۔ چنانچہ نرالا نے خواہ حسن کی محفل میں شوق کے ترانے چھیڑے ہوں یا انقلاب کی بزم میں آتشیں نغمے گائے ہوں مگر اثر آفرینی کے اعتبار سے فن پر ان کی گرفت ہمیشہ مضبوط رہی۔ اس کے علاوہ شاعرانہ اظہار کے لیے نرالا نے جو وسائل اختیار کیے یا جن ذرائع اثر آفرینی سے کام لیا۔ اس کا شیکسپیرین عہد SHAKESPERIAN AGE کی شاعری کی روایات سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لیے کہ موضوع کے اعتبار سے اس باغی شاعر کے یہاں آزاد نظم میں بھی کلاسیکی ہیئت کا پورا اہتمام اور سلیقہ نظر آتا ہے۔ جو انگریزی ادب میں شیکسپیر (SHAKESPEAR) کے عہد کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ نرالا کی شاعری میں یہی وہ مقام ہے جہاں فرد اور سماج ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

نرالا نے جب آزاد نظمیں لکھنی شروع کیں تو ہندی کے روایت پرست نقادوں نے ان کی ہنسی اڑائی اور جب مشاعروں میں نرالا اپنی نئی نظمیں سنانے کے لیے کھڑے ہوتے تو ادب کے بہ نام نہاد پاسبان ان پر پھبتیاں کستے اور مطالبہ کرتے کہ ترنم کے ساتھ

اپنی پابند نظمیں سنائیں. کیونکہ شاعر کی آواز بہت اچھی تھی اور انھیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا
نرالا نے ادب کے ان پاسبانوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور انگلستان کی طرح سے
اسٹیج (STAGE) کی بنا ڈالی جہاں وہ خود بغیر ترنم کے ڈراموں میں اپنی آزاد
نظمیں سنانے لگے اور ان کی یہ تکنک اتنی مقبول ہوئی کہ پھر کبھی انھوں نے ترنم کے ساتھ
نظمیں نہیں سنائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری طوفان کی سی تیزی سے نئی نسل
کے ذہنوں پر چھا رہی تھی۔ اور ان کی شاعرانہ عظمت اور فکر میں عوامی رجحانات کی پختگی
کا احساس ہونے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ آنچ اتنی تیز ہوتی گئی کہ اس سے انقلابی شرارے
پھوٹنے لگے۔ اس موڑ پر پہنچ کر شاعر کو زندگی میں دو ایسے صدموں کا سامنا کرنا پڑا کہ
ان کا ذہنی توازن ایک طرح سے بگڑ گیا اور وہ تادم مرگ ان صدموں سے سنبھل نہیں سکے.
پہلا صدمہ تو نوجوانی کے عالم میں بیوی کا داغ مفارقت دے جانا تھا اور دوسرا صدمہ
جوان بیٹی کا چل بسنا تھا۔ شاعر کی زندگی میں یہ دو حادثے اتنے بڑے تھے کہ وہ ان کو جھیل
نہیں سکے۔ اور ان کی زندگی میں سونا پن سرایت کر گیا۔ اس سونے پن کو مٹانے کے لیے وہ
معشوق کی چوکھٹ پر رموز سجدہ سے آشنائی پیدا کرنے لگے۔ مگر اس دنیا میں انھیں اتنا
بھٹکنا پڑا اور اتنی خاک چھاننی پڑی کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئے اور اس بیزاری کو دور
کرنے کے لیے انھوں نے عشق، شراب اور بے راہروی کو اپنا مہمان بنا لیا۔ جس سے موجودہ
سماج میں چھٹکارا پانا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسان
غور و فکر کی منزلوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اس کا حشر مجاز اور نرالا کی
موت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

نرالا صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ پہلوان، ادیب اور مصور بھی تھے۔ اپنے اس
مخصوص کردار کی وجہ سے وہ دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی خودداری کا یہ عالم
تھا کہ اس حالت میں بھی جب کہ ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ انتہائی افلاس اور تنگدستی کا مقابلہ
کرتے ہوئے گزرا۔ لیکن انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور جس کسی نے بھی کوئی
سلوک کرنا چاہا اس سے انھوں نے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ ایک بار یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ

ڈاکٹر سمپورنا نند بذات خود شاعر کی مزاج پرسی کے لیے گئے اور ان سے درخواست کی کہ حکومت ان کے لیے وظیفہ مقرر کرنا چاہتی ہے تو انھوں نے اس کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان سے اسپتال میں داخل ہو کر علاج کروانے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں دارا گنج (الٰہ آباد کا ایک محلہ) چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا!" وہ ہمیشہ دولت اور ثروت کی نمود و نمائش سے بے پروا رہے اور اپنی وضعداری کو نبھاتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ پیسہ ان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اپنے جس مجموعے کو انھوں نے دو سو روپیہ میں پبلشر (PUBLISHER) کے ہاتھ فروخت کیا تھا اس پبلشر کو اس مجموعے سے جب ہزاروں روپیے کی آمدنی ہوئی تو دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اس سے رائلٹی طلب کریں۔ کیوں کہ انھوں نے صرف ایک ہی ایڈیشن کے حقوق فروخت کیے تھے تو شاعر نے یہ کہہ کر دوستوں کی زبان بند کر دی کہ "چلو اچھا ہوا کہ میری وجہ سے وہ ہزاروں کا آدمی تو بن گیا"۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو کچھ دے کر اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت انسان سمجھتے تھے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک لکھ پتی تاجر نے سردی سے بچنے کے لیے شاعر کو ایک قیمتی شال تحفہ میں دی لیکن دوسرے دن وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی شال ان کے پاس کام کرنے والے ایک ملازم نے اوڑھ رکھی ہے تو اس کو برا معلوم ہوا اور اس نے اس کا اظہار کر دیا۔ بس پھر کیا تھا شاعر کا موڈ بگڑ گیا اور انھوں نے کہا "تمہاری شال کتنے روپیوں کی تھی اتنے روپیے لو اور میرے پاس سے چلے جاؤ۔ یہ میری اپنی بات ہے کہ شال میں اوڑھوں یا پرانو کر اوڑھے۔ شال کی جتنی ضرورت مجھے ہے اتنی ہی ضرورت اس کو بھی ہے"۔

نرالا صرف ہندی کے ہی عالم نہیں تھے بلکہ وہ بنگالی، انگریزی اور سنسکرت پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ہندی ادب کو انھوں نے ان زبانوں کے ایسے شاہکار عطا کیے ہیں جو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وہ زبان اور انداز بیان کی ذرا سی غلطی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم ہو یا نثر زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف ستھری اور نکھری ہوئی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں نرالا کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر میں یہ لکھوں کہ ان کی نظمیں "تلسی داس" اور "رام شکتی پوجا" یا "کون تم کے پار"

(कौन तम के पार) ہندی ادب میں گرانقدر اضافہ ہے تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ ہندی شاعری کو نرالا کی سب سے بڑی دین بغاوت اور انقلاب ہے۔ نرالا سے قبل یہ دونوں باتیں ہندی شاعری میں ایک طرح سے ناپید تھیں۔ لیکن انھوں نے سماج سے بغاوت اور سماج کو بدلنے کے لیے انقلاب کا نعرہ شاعرانہ انداز میں بلند کیا اور آخر وقت تک وہ اس کے پیامبر رہے۔ اسی طرح سے ہندی شاعری کو نرالا کی دوسری دین ان کے گیت ہیں۔ ہندی میں گیتوں کا جو تجزیہ نرالا نے کیا ہے وہ ان کی اپنی خصوصیت ہے۔ ان گیتوں میں جہاں کلاسیکل موسیقی کا پُٹ شامل ہے وہیں سماجی بیداری کی چنگاریاں بھی ان میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ گیت موسیقی اور انقلابی تصورات سے ہم آہنگ ہوکر ایک نیا سندیش دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے گیتوں میں شاعر نے سماجی حیثیت سے بچھڑے ہوئے طبقے اور خاص طور پر طوائفوں کے تعلق سے بہت کچھ کہا ہے جن کے پاس مرد اپنا غم غلط کرنے کے لیے جاتے ہیں اور ان کے دکھ بھرے جسموں کو کرایہ پر لے کر رات بھر یہ سوچتے ہوئے پڑے رہتے ہیں کہ صبح کاذب نمودار نہیں ہوگی۔ ان پر نرالا نے بڑے طنزیہ انداز میں چوٹ کی ہے۔

ایک بار بس اور ناچ تو شیاما
ساماں سبھی تیار
کتنے ہی ہیں اسور، چاہیئے تجھ کو کتنے ہار!

एक बार बस और नाच तू श्यामा
समान सभी तयार
कितने ही है असूर, चाहिए तुझको कितने हार।

اس طرح " جمنا کے لیے "۔ " پریہ کے لیے "۔ " ترنگوں کے لیے "۔ اور " آبشار کے لیے "۔ ایسے گیت ہیں جن کا مقابلہ " شیلی " کی (WESTLAND) " کیٹس " کی ODE TO NIGHTANGLE اور " ورڈس ورتھ " کی ODE ON THE INTIMATION OF IMMORTALITY سے کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ جدو جہد ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نرالا نے زندگی کی جدو جہد سے بہت کچھ سیکھا تھا اور اس سے جو کچھ حاصل ہوا اسے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندستانی سماج کو واپس لوٹا دیا جو جدید ہندی شاعری کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ زندگی کی اسی جدو جہد کے دوران میں انھیں "رام کرشن مشن" سے بھی سہارا ملا۔ جہاں ان کے فلسفیانہ خیالات کی تشفی کا سامان مہیا ہوا۔ "رام کرشن پرم ہنس" اور "سوامی ویویکا نند" کے فلسفہ نے ان کی شاعری اور شخصیت کو جو ضیا بخشی اور شاعر نے ان دونوں کے فلسفۂ زندگی کو بنیاد بنا کر جس نئی ہندی شاعری کی تخلیق کی۔ اس میں آج بھی وہ منفرد مانے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "جاگو پھر ایک بار" میں آزاد روح کا جو ترانہ ملتا ہے وہ "گیتا" کے "کرم یوگ" (कर्मयोग) اور "ویدانتک فلاسفی" کے نقطۂ نظر کی تشریح ہے۔

نرالا کی پیدائش ایک بھرے پرے خاندان میں ہوئی تھی۔ لیکن یہ تین سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ ممتا سے محروم ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان میں ایک طرف خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تو دوسری طرف انھیں زندگی کی گاڑی کو چلتا رکھنے کے لیے معاشی جدو جہد سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ جس کی بنا پر ان میں موجودہ سماج کے تعلق سے ایک قسم کی برہمی اور تلخی پیدا ہو گئی۔ اور اس تلخی نے ان کی شاعری کے اس روپ کو نکھارا۔ جسے "ہندی شاعر میں نیا آہنگ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ "شکتی" کے روپ میں ماں کے تصور کا ذکر نرالا نے اپنی شاعری میں کئی جگہ کیا ہے۔ اور ان کی نظم "پنچ وٹی" (पंचवटी) کی ماں بھی وہی ہے جو قاضی نذرالاسلام کی شاعری میں "شکتی کے روپ" میں دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح نرالا نے غموں کے بعد جس دنیا کا تصور باندھا تھا وہ اس طرح کا ہے۔

ماں مجھے وہاں تو لے چل
دیکھوں گا وہ ڈوار
دوس کا پار

مُرچھت ہوا پڑا ہے جہاں
ویدنا کا سنسار!

मॉं, मुझे वहा तू ले चल
देखूँगा वह द्वार
दिवस का पार
मुर्छित हुवा पड़ा है जहाँ
वेदना का संसार

ہندی شاعری میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIOT) کی شاعری کو بنیاد بنا کر بہت سے شاعروں نے ترقی پسند ادبی تحریک کا مذاق اڑانا شروع کیا تو شاعر کو جلال آگیا اور اس نے بھرپور طنز کے ساتھ ایسے شعرار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کہیں کا روڑا کہیں کا لیا پتھر
ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جیسے دے مارا
پڑھنے والوں نے جگر پر ہاتھ رکھ کر
کہا کیسا لکھدیا سنسار ساگر!

कही का रोड़ा कही का पत्थर
टी॰एस॰ ईलियट ने जैसे दे मारा

पढ़ने वालों ने जिगर पर हाथ रख कर
कहा, कैसा लिख दिया संसार सागर।?

چودہ سال کی عمر میں شاعر کی شادی کردی گئی تھی۔ اس وقت انھیں ہندی نہیں آتی تھی۔ اور ان کی بیوی ہندی کی اچھی خاصی پنڈت تھیں — بیوی نے نرالا کی شخصیت کے بنانے اور سنوارنے میں اسی طرح سے مدد دی جس طرح سے کالی داس کو کالی داس بنانے میں ان کی بیوی "وِدیوتما" (विद्योतमा) نے یا پھر تلسی داس کو تلسی داس بنانے میں

ان کی بیوی "رتناولی" (रत्नावली) نے دی تھی۔ جس طرح کیٹس (KEATS) کہتا ہے کہ مجھے شاعرانہ تحریک (POETIC INSPIRATION) شیکسپیر (SHAKESPEARE) کی روح سے ملتی ہے اسی طرح سے نرالا بھی اپنی شاعری میں بیوی کی روح سے (INSPIRATION) حاصل کرتے ہیں اور اس کو "دیوی پریرنا" (प्रेरणा) کا نام دیتے ہیں۔

تمہیں گاتی ہو اپنا گان
دیہ رتھ میں پاتا ہوں سمان
بھاونا رنگ دی تم نے پران
چھند بندوں میں نج آہوان

तुम ही गाती हो अपना गान
व्यर्थ मे पाता हूँ सम्मान
भावना रंग दी तुमने प्राण
द्वन्द बन्दी मे जिन आह्वान।

نرالا اپنے آپ کو فرد نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے آپ کو پورا کا پورا ہندی ادب تصور کرتے تھے۔ اور یہ ان کے "انا" (EGO) کی انتہا تھی۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے اگر نرالا کی شاعری اور شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں " EGO ED " اور " SUPER EGO " مستقل طور پر اور منظم انداز میں پایا جاتا تھا جو ان کی ذہنی ساخت کا ردعمل تھا۔ اگر نرالا عام انسانوں کی طرح سے زندگی گزار سکتے تو شاید سماجی نقطۂ نظر سے ان کی شخصیت عام انسانوں کی طرح سے پروان چڑھتی۔ لیکن جن حالات اور ماحول سے نرالا کو گزرنا پڑا اس کے نتیجے کے طور پر "انا" ان میں سما گئی تھی اور ان کی شخصیت میں ایک ایسا انوکھا پن سرایت کر گیا تھا جو عام انسانوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہوا نظر آتا

ہے اس لیے ہم ان کی شخصیت اور شاعری کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھ سکتے۔

نرالا کی شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت آمیز ہندی میں شاعری کیا کرتے تھے۔ جو عام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی تھی۔ ایک حد تک یہ اعتراض بجا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاعر نے جن فلسفیانہ خیالات پر شاعری کی بنیاد رکھی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ سنسکرت کا سہارا لیتے ورنہ ان کی شاعری روکھی پھیکی ہوکر رہ جاتی۔

نرالا نے اردو میں بھی شاعری کی ہے اور ان کی غزلیں مشہور بھی ہوئیں۔ لیکن ان میں فن اور خیالات کا وہ رچاؤ نہیں ہے جو ان کی ہندی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو غزلوں کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے:

نگہ تمہاری تھی دل جس سے بے قرار ہوا
مگر میں غیر سے مل کر نگہ کے پار ہوا

کنارہ وہ ہم سے کیے جا رہے ہیں
دکھانے کو درشن دئے جا رہے ہیں

۱۵ ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کے بعد مادی حیثیت سے نرالا ہمارے درمیان میں نہیں رہے لیکن ساٹھ سال تک انھوں نے قلم کے سپاہی کی حیثیت سے ادب اور سماج کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی ذہنی اور جسمانی طور پر بستر مرگ پر پڑے پڑے بھی۔ مہابھارت کے مشہور کردار بھیشم کی طرح نرالا نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانیت کے لیے ریشمی ہار

گوندھتے رہے اور ان کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ان کی انگلیوں نے جواب نہیں دیدیا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا نہیں ہوگئے۔ فطرت کے اس عمل کی وجہ سے جسمانی طور پر نرالا کی روح کو سکون نصیب ہوگیا ہو لیکن ہمارے ادبی قافلے کو انھوں نے جو روح عطا کی تھی وہ آج بھی زندہ اور بے چین ہے اور جن شاعرانہ روایات اور اقدار کو انھوں نے جنم دیا تھا اور ادب پر جو انمٹ نقش چھوڑے ہیں اس کے سہارے ہمارا ادبی کارواں رواں دواں رہے گا تاکہ ہم اپنے ادب کو انسانیت کے بہتر مستقبل کے لیے سنوار سکیں !!۔

تلگو کا انقلابی شاعر ـــــ سری سری!

۱۹۴۳ء کی بات ہے، مجھے کمیونسٹ پارٹی کے ایک والنٹیر دستے کے ساتھ وجے واڑہ (آندھرا) جانے کا موقع ملا، جہاں کل ہند کسان سبھا کا سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا اور سوامی سہجا نند سرسوتی کی جگہ پنڈت راہل سانکر تیاین مسند صدارت کو رونق بخشنے والے تھے۔ اس موقع پر مندوبین کے ایک کیمپ پر بے پناہ ہجوم تھا اور ہمیں حکم ملا تھا کہ ہم جا کر دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک سانولا سلونا نوجوان تلگو میں اپنی شاعری سنا رہا ہے اور سامعین اس کے ہر شعر پر داد دے رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ تلگو کے انقلابی شاعر سری سری ہیں۔ اس موقع پر ہم کیا دیکھتے ہیں کہ مجمع کے درمیان ایک سیکل پر سوار دو شخص آکر مجمع میں گھل مل جاتے ہیں یہ کوئی اور نہیں بلکہ کامریڈ سندریا اور پی سی جوشی ہیں جو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ سری سری کی شاعری کا یہ لامتناہی سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا اور ہم تھک ہار کر اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔ اس کے بعد سے کئی مواقع ایسے آئے جب سری سری کو بہت ہی قریب سے دیکھنے، سننے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا جب وہ پارٹی کے جلسوں یا ترقی پسندوں کے اجتماع میں شریک

ہونے آیا کرتے تھے۔

سری سری اپنے زمانے کے انقلابی ہی نہیں بلکہ انقلابی شاعری کے ہراول دستے کے میر کارواں تھے۔ انھوں نے تلگو شاعری کے اسلوب میں نئی جاذبیت و جامعیت اور مشاہدے کی قوت وادراک سے ایک ایسا زلزلہ پیدا کردیا تھا جو قدیم سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود اس سے اپنا رشتہ بھی باقی رکھا تھا اور یہی بات آج کے تلگو کے دو قد آور شاعروں یعنی داسرتھی (مرحوم) اور سی۔نارائن ریڈی کی شاعری میں پائی جاتی ہے تلگو شاعری سے میری واقفیت داسرتھی کے ذریعہ ہوئی جب کہ وہ اور میں دونوں نظام شاہی دور میں ایک ساتھ جیلوں میں بند تھے اور جیلوں میں ادبی ہنگامے برپا کرنا ہمارا شعار بن گیا تھا۔

۱۸۵۱ء میں تلگو شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور ویریشلنگم پنتلو، تلگو ادب کے تمام اصناف میں نیا اسلوب، نیا آہنگ اور نیا پیغام دینے والے پیامبر کی حیثیت سے مشہور ہیں اور جن لوگوں نے ویریشلنگم پنتلو کی روایات کو استحکام بخشا ہے ان میں سرفہرست سری سری کا نام آتا ہے — بڑے شاعر کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنا لکھا ہے بلکہ یہ ہے کہ اس نے کیا لکھا ہے اور اس کی تحریر سے عوام کس حد تک مستفید ہوئے ہیں۔ جدید ہندستان کی تاریخ میں پہلی جنگ عظیم کے درمیان فاصلے کو ہم ایک نئے دور کے آغاز سے منسوب کر سکتے ہیں جب کہ قومی تحریکیں چھوٹے بڑے چشموں کی صورت میں رواں دواں نظر آتی ہیں اور قومیت ایک بڑے گروہ کے لیے فلسفۂ زندگی اختیار کر لیتی ہے اس دور میں تلگو ادب اور خاص طور پر سری سری ایک پراثر شخصیت کے طور پر چھا جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں داسرتھی اور سی نارائن ریڈی کی ترقی پسندانہ شاعری کے انمول خزانے ہاتھ لگتے ہیں۔

سری رنگم سری نیواس راؤ (سری سری) ۲؍ جنوری ۱۹۱۰ء میں وشاکھاپٹنم میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور کالج کی تعلیم کو ختم کرنے کے بعد وہ انقلابی شاعر سری سری کے نام سے تلگو دنیا میں مشہور ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ مارکسزم کے

زیر اثر آئے اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو کر ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی بنیاد رکھی اور باشعور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس نے نہ صرف تلگو ادب کی کایا پلٹ دی بلکہ اپنے ہم عصر دوسری زبانوں کے ادیبوں کو بھی ایک حد تک متاثر کیا۔ ایک دفعہ ترقی پسند ادیبوں کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے سری سری نے کہا تھا کہ "اگر ہم ترقی پسند ادیب ہیں اور ہمارا ادب فرض کا پابند ہے تو پھر ہمیں کبھی کبھار مل بیٹھنے اور بحث و مباحث کے بعد کان میں تیل ڈال کر نہیں سونا چاہیے اس سے فرد کی اصلاح تو ممکن ہے لیکن ہم ماحول کو بدلنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتے۔" یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ گرزادہ اپا راؤ نے جو تلگو ادب کی نشاۃ الثانیہ کے نقیب ہیں ——— جن جذبات و خیالات کو تلگو ادب میں سمویا تھا اس کی ترقی یافتہ شکل ہمیں تلگو کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں میں ملتی ہے اور ان میں سرفہرست سری سری کا نام آتا ہے۔

ترقی پسند شعراء میں سری سری ہی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے نظم اور نثر کے ساتھ ساتھ گیتوں کی بھی تخلیق کی تھی۔ انھوں نے تلگو فلموں کے لیے سینکڑوں گیت لکھے اور ان کو فروخت بھی کیا لیکن اپنے ضمیر کا کبھی سودا نہیں کیا۔ مظلوم انسانیت کی بقا کے لیے انھوں نے اپنے نغموں کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی انمول قدروں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں" لیکن جن لوگوں نے "مہا پرستھانم" (महाप्रस्थानमु) کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ مستقبل کے بھی شاعر تھے جنھوں نے "مہا پرستھانم" میں مارکسزم کے زیر اثر غیر طبقاتی سماج کی تشکیل کا پیام دیا ہے۔ سری سری اور ان کے ساتھیوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ شاعری صرف پڑھے لکھے طبقے کی میراث نہیں ہے بلکہ وہ عوام کی زندگی کا بھی ایک جز ہے۔ وہ "مہا پرستھانم" کی ایک کویتا "مانوڑو" (मानवडु) میں کہتے ہیں کہ

خوبصورتی کی چاہت رکھنے والے اے کاری گر انسان

کیڑوں، مکوڑوں، پھول اور پتیوں کے محافظ
اور ان کی خوبصورتی کے سیوک !
آلام و آلائش کا بوجھ ڈھونے والے انسان
اس دنیا کے وسیع خاندان کے فرد
اپنے بھائی، عوام کے محافظ، خوبصورتی کے پجاری
اے انسان، اے انسان !!

ریڈیائی ڈراموں کے میدان میں جہاں گوما شاستری، کٹمب راؤ، آرو ڈرا، نارائن ریڈی اور بیراگی کے نام لیے جائیں گے وہاں سری سری کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سری سری کے ریڈیائی ڈرامے فنی نقطۂ نظر سے خواہ کمزور ہی سہی لیکن ان کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔

ہندی ادب میں جس طرح سے چھایا واد کے ردعمل کے طور پر ترقی پسندی کی بنیاد پڑی اسی طرح سے تلگو ادب میں "بھاؤ کویتا" کے ردعمل کے طور پر شاعری میں حقیقت پسندی کو استحکام ملا۔ مارکسزم کے زیر اثر سری سری نے شاعری میں حقیقت پسندی کو پورے طور پر استعمال کیا اور نئی شاعری کو پروان چڑھانے کے لیے "نوساہتیہ پریشد" کی نیو رکھی جو بعد میں "ابھی تیلو سنگھم" میں تبدیل ہوگئی مگر اس نئی شاعری کے استحکام کا سہرا کسی کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ سری سری ہی ہیں جنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

قافیوں کی جکڑ بندیوں کو توڑ کر
جذبات کا اظہار کریں
اگر کوئی کہے کہ بیوقوف یہ کیا ہے ؟
تو ہم کہیں گے شاعری ہے !!

سری سری اپنی شاعری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ:

سندور، چندن، خون

بندوق، سندھیا، راگ
مجروح شیر، خونِ آہو
انسان کی کھوپڑی
اور کالی ماتا کی زبان چاہیے
اس نئی شاعری کے لیے !!

آگے چل کر وہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ

ہلنے والی، ہلانے والی
بدلنے والی، بدلانے والی
گہری نیند سے جگانے والی
مکمل زندگی عطا کرنے والی
یہ ہے میری نئی شاعری !!

یہی وجہ ہے کہ وہ تلگو شاعری میں سب کے لیے مشعل راہ بنے رہے اور انقلابی قوتوں کی رہنمائی کی۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ مرد مجاہد تھے، مقنن بھی بنے اور عاشق مزاج بھی۔ انھوں نے زندگی کی بھرپور بہاریں دیکھیں اور ان سے فیض یاب بھی ہوئے اور دوسروں کو بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دنیا کی سیر کی، کئی انعامات اور اعزازات حاصل کیے جو دوسروں کو پیروی کرنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتے۔

سری سری کی شاعری تین ارتقائی منزلوں سے گزری ہے، ایک ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے جو بہت ہی مختصر مگر اہم زمانہ ہے، دوسرا زمانہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۰ء کا ہے جو سب سے طویل ہے جس میں انھوں نے " مہا پرستھانم " کی تخلیق کی ہے۔ یہ شاعر کے جوش و امنگ کا زمانہ ہے اور اس پر ماحول کا اثر بھی ہے۔ تیسرا دور ۱۹۶۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے جہاں سے وہ ایک نئے فلسفۂ حیات کی جستجو میں بھٹکنے لگتے ہیں اور یہ اتنا نازک موڑ ہے کہ وہ صرف نعرۂ انقلاب کے اسیر بن جاتے ہیں اور بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں کمیونسٹ پارٹی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے نظریہ اور عمل

کے درمیان ایک حدفاصل حائل ہو جاتی ہے اور انقلابی شاعر تھک کر راستے میں سستانے لگتا ہے اور شراب وشباب کی معصیت میں گرفتار ہو کر اپنے مقصد حیات کو ایک حدتک فراموش کر کے یادِ ایام کھو جانے کی سعی کرتا ہے مگر اس کے اندر کا انسان اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے جس کا اظہار ان کی ایک نظم "آنسو" میں اس طرح ہوا ہے :۔

آنکھ کا آنسو سفر پر نکلا
جنگلوں پہاڑوں کو پار کرتا ہوا
موسم برسات کی رواں دواں ندی کے کنارے پہنچا
تو ندی نے طنزیہ قہقہہ لگایا !
ایک بوند کی حقیقت کیا ہے ؟
دنیا ناپنے نکلا ہے
کہیں کھو جائے گا !
آنسو سے رہا نہیں گیا
اور وہ ہنس پڑا
اری ! دیوانی
کھو جائے گی تو، جو کھو جانے کے لیے
وجود میں آئی ہے
میں تو کسی کی آنکھ کا تارا ہوں
جہاں کہیں جاتا ہوں
ہر آنکھ میری بلائیں لیتی ہے !
میں دل جوڑنے نکلا ہوں
اپنے آپ میں کھو جانے کے لیے نہیں !!

زندگی کے آخری دور میں سری سری ترقی پسندوں سے ناطہ توڑ کر انقلابی ادیبوں کی ایک الگ انجمن بنائی اور اس کی مسند صدارت کو رونق بخشی۔ اس دور

یں ان میں ایک طرح کی جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور وہ غم و غصہ کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔
"دِگمبر" کو تیا کو بھی غیر منصفانہ سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کا رد عمل قرار دیتے ہوئے
انھوں نے اہلِ قلم کی مصلحت بینی کو بڑی بے رحمی سے ہدف تنقید بنایا۔

۱۵ر جون ۱۹۸۴ء کا دن ہماری ادبی تاریخ کے لیے سانحہ کا دن ہے جسے ہم آسانی
سے فراموش نہیں کر سکتے۔ اس دن سری سری کی موت نے ہم سے ایک انقلابی شاعر کو
چھین لیا جو آتش نوا، بیدار مغز اور جدید ترین ذہنوں سے ہم آہنگ تھا ع

فروغ بزم جواب ہے رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

کشمیری زبان کا عوامی شاعر "مہجور"

کشمیر کی خوب صورت وادیاں دل کش مناظر صحت بخش سبزہ زار اور رومان پرور جھیلیں ہمیشہ سے جنت نگاہ رہی ہیں۔ شعرائے اس پھولوں کی سرزمین کے راگ الاپے ہیں۔ افسانہ نگاروں اور فنکاروں نے اس بہاروں کی بستی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سیاحوں نے اس حسن و جمال کی دنیا کے قصیدے پڑھے ہیں۔ مگر اس کے برعکس باشندگان کشمیر کی پسماندگی ابھی تک دور نہیں ہو سکی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فطرت اور انسانیت صدیوں سے تقسیم ہوتی چلی آرہی ہے۔

کشمیر کا ایک بڑا حصہ تبتی علاقہ ہے جہاں کئی قبیلے آباد ہیں جو آسٹرو ایشیائی خاندان سے نکلنے والی بولیاں بولتے ہیں۔ کشمیر تو صرف ان حصوں سے گھرے ہوئے علاقے کا نام ہے جس میں سری نگر، گلمرگ اور پہل گام وغیرہ جیسے مشہور مقامات شامل ہیں۔ اور اسی حصہ میں بولی جانے والی زبان کو کشمیری بھاشا کا نام دیا گیا ہے اور یہ بھاشا پورے کشمیری خطے میں بولی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کشمیری نام سنسکرت زبان کے "کشمیرکا" سے نکلا ہو۔ کیونکہ اس زبان پر صدیوں سے سنسکرت اور فارسی زبان کا دباؤ پڑتا آیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً پچاس لاکھ ہے۔

اس زبان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی اپنی قواعد ہے۔ پندرہ سو سال قبل آریاؤں نے یہاں بسنے والے قبائل پر اپنا اقتدار جما کران پر حکمرانی شروع کی اور انھوں نے سنسکرت کو راج بھاشا بنایا اور وہ تقریباً ایک ہزار برس تک اس زبان کو سنسکرت سے متاثر کرتے رہی لیکن اس کی بناوٹ اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ اس کا اندرونی ڈھانچہ ٹوٹ سکا۔ کشمیری عوام نے سنسکرت زبان کی طاقت کے آگے سرتسلیم خم نہیں کیا بلکہ اپنی مادری زبان کی انفرادیت کو باقی رکھا۔ کشمیر کا تھوڑا سا ادب ہمیں شاردا زبان میں بھی ملتا ہے۔ جو اس وقت بھی لاہور کے میوزم میں محفوظ ہے اور آج کل تو اس زبان کا کہیں بھی رواج نہیں ہے۔ آریاؤں اور برھمنوں کے دور حکمرانی کے بعد مسلمانوں نے کشمیر کو فتح کر کے فارسی زبان کو سنسکرت کی جگہ رائج کیا۔ جس کی بنا پر فارسی رسم الخط کا بھی رواج پڑا۔ لیکن اس میں سب سے بڑی خامی یہ پائی گئی کہ صوتی اعتبار سے فارسی پورے طور پر کشمیری زبان کے الفاظ کو ادا نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس کے یہ اثرات دیر پا ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ اثرات اتنے گہرے تھے کہ آج تو جدید لکھنے والوں کے سامنے رسم الخط کا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور وہ دونوں زبانوں میں (فارسی اور سنسکرت) کچھ خاص اشاروں سے کام لے کر اپنی تخلیقات کو عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک فارسی زبان کا زور تھا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آج یہاں پر شہروں میں فارسی آمیز کشمیری زبان بھی بولی جاتی ہے۔

برہمنوں کے دور حکمرانی میں کشمیری زبان کے ادب کا کیا حال تھا اس کا کوئی مستند حوالہ ہمیں ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ کیونکہ چودھویں صدی سے قبل کی تخقیقات محفوظ نہیں رہ سکیں۔ سلطان زین العابدین کے دور حکمرانی یعنی ۱۴۱۷ء سے ۱۴۶۵ء میں کسی غیر معروف شاعر کی لکھی ہوئی ایک نظم "راناسرودہ" ملتی ہے۔ جو شاید کشمیری زبان میں کہی جانے والی پہلی نظم ہے۔ تصوف پرست شاعرہ ۔۔۔ للہ دے ۔۔۔ کشمیری زبان کی پہلی شاعرہ گزری ہیں۔ جنھیں کبیر داس کی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی

مانتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ اس زمانے میں شیخ نورالدین اور سوم پنڈت نے بھی کشمیری زبان میں نظمیں کہی ہیں۔ مگر اس دور کی جس اصل شاعری کا ہمیں پتہ چلا ہے اس میں زیادہ تر خواتین کی تخلیق کردہ نظمیں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ مرد تو درباری ہو گئے تھے۔ اور وہ فارسی میں اپنے خیالات کو پیش کیا کرتے تھے۔ اکبر اعظم نے جب کشمیر کو فتح کیا تو وہاں کی مشہور شاعرہ ملکہ حبّہ خاتون تھیں۔ جن کے خاوند کو اکبر کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس واقعہ کا شاعرہ پر اتنا اثر پڑا کہ وہ جوگن بن کر گھر سے نکل گئیں۔ اور پھر ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ان کی بہت سی نظمیں آج بھی عوام الناس کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح انیسویں صدی عیسوی تک ہندو اور مسلمانوں نے مل کر کشمیری زبان وادب کو پروان چڑھایا۔ لیکن جس شخص نے آج سے سو سال پہلے جدید کشمیری ادب کی بنیاد رکھی اس کا نام محمود گامی ہے۔ اس نے کشمیری زبان میں ایرانی طرز پر "یوسف زلیخا" "لیلیٰ مجنوں" وغیرہ کی تخلیق کی۔ لیکن ان کی یہ تخلیقات فارسی سے بھرا کشمیری بھاشا میں تھیں۔ اس لیے ان تصنیفات کو اعلیٰ طبقہ میں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ لیکن اس کے بعد سے سینکڑوں ادیبوں نے اسی کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا۔ مگر اس زمانہ میں فارسی کا اتنا زور تھا کہ ان ادیبوں کی تخلیقات کو حکومتی ایوانوں سے یہ کہہ کر پھینک دیا گیا کہ یہ صرف جاہلوں کی بکواس ہے۔۔۔ پھر بھی سیف الدین اور سنتی پنڈت اس دور کے اچھے ادیب مانے گئے ہیں جن کی آج بھی قدر کی جاتی ہے۔

سری رام پور کے عیسائیوں نے ۱۸۲۱ء میں بائبل کا "شاردا" زبان میں ترجمہ کیا لیکن یہ ترجمہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکا۔ اس لیے انھیں مجبوراً فارسی میں ترجمہ کروانا پڑا۔ ۱۸۷۹ء میں پنڈت ایشور کانت نے سنسکرت میں کشمیری زبان کی لغت مرتب کی۔ جسے بعد میں گریرسن نے ۱۸۹۳ء میں اپنی زیرادارت شائع کیا۔ کشمیری زبان کی لوک کتھاؤں اور گیتوں کا سب سے اچھا اور نمائندہ مجموعہ ۱۸۹۳ء میں جے ہنٹن نولے نے مرتب کیا۔ لیکن جب کشمیری عوام کا شعور بیدار ہونے لگا تو انھوں نے کشمیری زبان کی ایک مستند تاریخ مرتب کی اور پروفیسر کول اور پرتھوی ناتھ وغیرہ

نے اس زبان کے ادبی ذخیروں کی جو چھان بین کی ہے وہ آج بھی قابل ذکر ہے۔

بیسویں صدی عیسویں میں کشمیری زبان کے تین مشہور شاعر گزرے ہیں۔ مہجور، آزاد اور غلام حسن بیگ۔ ہم اپنے اس مضمون میں صرف مہجور کا ذکر کریں گے کیونکہ کشمیری ادب میں ان کا بہت بلند مرتبہ اور مقام ہے۔ آزاد اور بیگ نے نہ صرف ان سے اکتساب کیا ہے بلکہ عوامی شاعر کے درجے تک پہنچنے کے لیے ان لوگوں نے مہجور کی نمایاں سرپرستی بھی حاصل کی ہے۔

غلام احمد مہجور بہت ہی سنجیدہ شخصیت کے حامل تھے۔ لمبا قد گورا رنگ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "آپ اپنی شاعری میں فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیوں نہیں کرتے ہیں۔" مہجور نے جواب دیا کہ "اس سیلاب کو روکنے کے لیے تو قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے"۔ ان کے اس بیان میں تصنع نہیں بلکہ حقیقت کی نمایاں جھلک پائی جاتی تھی۔

سری نگر سے بائیس میل دور "اونتی پور" کے قریب "پل ماوا" قصبہ میں ۱۸۸۷ء میں مہجور پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیرزادہ تھے جن کی چھوٹی سی کھیتی باڑی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد یہ سری نگر میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کے استاد خود بھی شاعر تھے۔ جن کا عاشق تخلص تھا۔ جو فارسی اور کشمیری زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں انھوں نے مہجور کے متعلق یہ پیشن گوئی کی تھی کہ "یہ لڑکا مستقبل میں بہت بڑا شاعر ہوگا" اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مہجور اپنے گاؤں واپس ہوئے تو والدین نے اپنے آبائی پیشہ پیری و مریدی کی جانب انھیں متوجہ کیا۔ لیکن مہجور کو اس پیشہ سے نفرت تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔ والدین کو بیٹے کی یہ حرکت پسند نہ آئی اور مجبوراً نابالغی ہی میں مہجور کو گھر سے نکل جانا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر

سترہ سال کی تھی۔ ملازمت کی تلاش میں یہ ۱۹۰۵ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں سے امرتسر گئے اور خوش نویسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات اس عہد کے بڑے بڑے شاعروں سے ہوئی۔ اس وقت علامہ شبلی امرتسر میں مقیم تھے اور مہجور بھی ان دنوں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ اس لیے ایک دوست کے ساتھ علامہ شبلی سے ملنے گئے اور ان کو اپنی فارسی کی چند نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ شبلی نے ان سے مسکراتے ہوئے دریافت کیا کہ "یہ تخلص کس کے ہجر کا اظہار ہے" تو انھوں نے جواب دیا کہ اپنے وطن کا "پھر علامہ نے دریافت کیا "آپ کس سے دور پڑے ہوئے ہیں" مہجور نے کہا "اپنے وطن سے" علامہ شبلی نے ان کے اشعار پسند کیے اور اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ "یہ لڑکا ذہین ہے اور اپنے وقت کا اچھا شاعر ہوگا"

۱۹۰۷ء میں مہجور واپس سری نگر ہوئے۔ اس وقت چودھری خوشی محمد ناظر وہاں مہتمم بندوبست تھے وہ خود بھی شاعر تھے۔ مہجور نوکری کی تلاش میں تھے۔ اس لیے انھوں نے ملازمت کی درخواست نظم کرکے چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ چودھری صاحب نوجوان شاعر کی اس قابلیت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ جب وہ دورہ پر لداخ تشریف لے گئے تو مہجور کو بھی ساتھ لیتے گئے اور پٹواری گری کے "اونچے عہدے" پر مامور کر دیا۔ اس وقت انھیں آٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ۳۸ سال تک نوکری کرنے کے بعد جب ان کے وظیفے کے دن قریب آئے تو ان کی تنخواہ میں ڈھائی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ یعنی انھیں بیس روپے ماہانہ جیسی بڑی تنخواہ ملنے لگی تھی۔ آخر میں مہجور ملازمت اور تنگدستی سے عاجز آکر چالیس سال ملازمت کرنے کے بعد وظیفے کر علیحدہ ہو گئے اور عہد کیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت کشمیری عوام اور ادب کی خدمت کرنے میں صرف کریں گے۔ ۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ مہجور کے بہت سے ساتھی اور احباب صوبہ پنجاب میں مقیم تھے۔ اور یہ ان سے خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ اس کی بنا پر ریاستی محکمہ خفیہ پولیس کو یہ شبہ گزرا کہ "مہجور برٹش انڈیا کے لیڈروں سے خط و کتابت کرتا ہے اور ان کے خیالات کشمیر میں پھیلا رہا ہے نہیں تو اس کی شاعری اتنی مقبول نہیں ہو سکتی" اسی شبہ کی

تحقیقات میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر مہجور کا تبادلہ ضلع مظفر آباد میں سری نگر سے ڈیڑھ سو میل دور کشمیر کے سرحدی مقام پر کر دیا گیا۔ لیکن جب جرم ثابت نہ ہو سکا تو انھیں واپس سری نگر بلوا لیا گیا۔ یہ بات انتہائی قابل ذکر ہے کہ کشمیر کے اس بڑے شاعر کو اپنی زندگی میں صرف ایک بار کشمیر کی سرحدوں سے باہر یعنی پنجاب جانے کا موقع ملا تھا۔ یوں تو یہ ملازمت کے سلسلے میں پورے کشمیر کا چکر لگا چکے تھے۔

۱۹۰۷ء میں پنجاب سے واپس آنے کے بعد مہجور نے ایک کسان لڑکی سے شادی کی اور سری نگر میں ٹنکی کدل کے پاس ایک چھوٹا سا مکان بھی تعمیر کر والیا۔ ان کے ہاں ایک ہی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے محمد امین رکھا۔ اور فارسی، عربی کی تعلیم کے علاوہ انگریزی کی بھی تعلیم دلوائی۔ ان کا پوتا ابدال مہجور ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہے۔

مہجور نے اپنی شاعری کی ابتدا، فارسی زبان سے کی۔ فارسی میں انھوں نے ساٹھ، ستر نظمیں کہیں جو مجموعے کی شکل میں ترتیب دی جا چکی ہیں۔ لیکن شاید ابھی تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو میں بھی شاعری کی اور ۱۹۲۰ء تک اردو ہی میں لکھتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی اس تبدیلی کا ایک خاص پس منظر ہے اور وہ یہ کہ پٹواری کی حیثیت سے دیہاتی عوام کے ساتھ ان کا روز مرہ کا تعلق رہتا تھا۔ لیکن ناخواندہ عوام ان کی شاعری کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اور نہ بحیثیت شاعر کے مہجور کی ان کے نزدیک کوئی قدر تھی۔ اس لیے مہجور اپنے شیش محل سے جنتا کے درمیان اتر آئے اور جنتا ہی کی زبان میں شاعری کرنے لگے۔ جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ "آپ اردو اور فارسی کو چھوڑ کر کشمیری زبان میں کیوں شاعری کرنے لگے تو انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے یہ جواب دیا کہ:

"جب قومی اور وطنی ذہنیت میرے اندر پختہ ہو چکی تو میں نے اپنی مادری زبان کو بے بسی کی حالت میں پڑا ہوا دیکھا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی بوچھاڑ کرنی شروع کر دی کہ میں اپنی مادری زبان کو

ترک کرکے دوسری زبانوں کی خدمت کو رہا ہوں۔ عہد ماضی کے تاریخی
واقعات نے میری آنکھیں کھول دیں کہ آج کی پسماندہ کشمیری زبان نے
صدیوں پہلے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کیے تھے مگر آج نہ صرف اس زبان
سے غیروں کو بلکہ خود اہل کشمیر کو انس نہیں ہے تو اسی کے بعد سے میں نے
عہد کیا کہ میں اپنی مادری زبان کی خدمت کروں گا۔ اور پھر اسے زندہ
جاوید زبان بنا کر چھوڑوں گا۔ میں نے کشمیری عہد رفتہ کے عوامی شاعر
رسول میر اور حبہ خاتون کی طرز پر نظمیں کہنی شروع کر دیں اور میں نے
دیکھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں میری نظمیں زبان زد عام ہو گئی ہیں۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مہجور کشمیری زبان کے سب سے بڑے عوامی
شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔ دیوندر ستیارتھی نے ۱۹۳۴ء میں "ماڈرن ریویو" میں سب
سے پہلے مہجور پر مضمون لکھ کر ہمیں ان سے متعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد بلراج ساہنی
نے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں "وشوا بھارتی" (انگریزی) میں ان پر دو
مضمون لکھے۔ جس میں انھوں نے مہجور کی عوامی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے
ایک جگہ لکھا کہ:

"اگر مہجور آج ایک گیت لکھتے ہیں تو وہ ایک پکھواڑے کے اندر
اندر عوام کی زبان پر چڑھ جاتا ہے۔ بچے اسکول جاتے ہوئے لڑکیاں
دھان کوٹتے ہوئے، مانجھی ناؤ کھیتے ہوئے اور مزدور کام کرتے ہوئے
سب کے سب گیت گانے لگتے ہیں۔ ایک غیر تعلیم یافتہ خطہ میں جہاں مشہور
شعرائے کے مجموعے پانچ دس کی تعداد سے زیادہ نہیں بکتے مہجور کی شاعری
کو ایک کرشمہ ہی سے تعبیر دی جا سکتی ہے۔"

مہجور کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتے ہوئے بھی کشمیر کے اعلیٰ طبقے نے ان کی شاعری
کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ آج تو مہجور کے گیت کشمیر کی ترائیوں میں رہنے والے بچے
بچے کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کشمیری تاریخ کے عالم پنڈت آنند نارائن کول

نے مہجور کے ایک ابتدائی گیت "اے میرے پھول" کا انگریزی ترجمہ کرکے "وشوا بھارتی" میں شائع کروایا تھا۔ اس وقت شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور زندہ تھے۔ انھوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے مہجور کو لکھا کہ "میں نے آپ کی نظم دیکھی۔ آپ کے میرے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اگر آپ بنگالی اور انگریزی سے واقف ہوتے تو میں کہتا کہ یہ خیال آپ نے میری نظموں سے حاصل کیا ہے۔ میں آپ کی نظم سے بہت خوش ہوا۔" اسی طرح جب ان کی دوسری نظم "کسان کی لڑکی" کا ترجمہ ٹیگور نے پڑھا تو انھوں نے دوبارہ مہجور کو لکھا کہ "تم کشمیر کے ورڈس ورتھ ہو" اس وقت کشمیر کا اعلیٰ طبقہ اپنی نیند سے چونک پڑا اور سری نگر میں منعقد ہونے والے ایک بڑے مشاعرے میں مہجور کو مدعو کیا گیا۔ وہاں پر اپنی نظم پڑھنے سے قبل مہجور نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ٹیگور کی یہ انسانیت دوستی اور مردم شناسی ہے کہ انھوں نے صرف ایک لفظ لکھکر میرے وطن کے لوگوں کو میری موجودگی کا احساس دلایا۔"

مہجور کی کشمیری نظموں کے تقریباً بارہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کشمیری زبان میں اردو کے ابتدائی شعرائے سے لے کر اب تک کے شاعروں کی ایک تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ جو "تواریخ اردو شعراء" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً ۲۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں سے آٹھ سو صفحات تو صرف اردو شاعری کی تاریخ کے بیان کرنے میں صرف ہوئے ہیں۔ جس میں تمام ہندو مسلم شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس غیر مطبوعہ تذکرہ کو دیکھ کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا تھا۔ مہجور نے کشمیری زبان میں ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس پر حکومتی عتاب نازل ہوا اور یہ بند کردیا گیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دوسرے ہی مہینے میں یہ دو ہزار کی تعداد میں شائع ہونے لگا تھا۔

مہجور کی شاعری کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی نظموں کا اردو میں کوئی نمائندہ مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ جہاں تک میں نے انگریزی تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں نزاکت

خیال اور باریکی" فن کا تنوع اور طرز بیان کی ندرت بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ ان کی شاعری محبت اور رومانس کی شاعری ہے لیکن انھوں نے سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ لیکن وہ اتنی مقبول نہیں ہوئیں جتنی کہ ان کی رومانی نظمیں ہوئی ہیں ۔ البتہ ہم اردو اور فارسی کے چند نمونے پیش کر سکتے تھے ۔ لیکن مہجور نے ایسا کرنے کی ممانعت کر دی تھی ۔ اس لیے کہ وہ عہد رفتہ کی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے ان کی کشمیری نظموں کے انگریزی تراجم کے علاوہ "شیرازہ" کے مہجور نمبر کے مطالعے سے مجھے ان کی شاعری سے جو واقفیت حاصل ہوئی ہے وہ یہ کہ ان کے ہاں آزادی اور محبت کے جذبہ کا ایک گہرا اور انمٹ احساس پایا جاتا ہے جس کی سماجی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت ہے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کسانوں میں گزرا ہے اور انھوں نے بہت ہی قریب سے ان کی غربت مفلسی، مجبوری اور نظریۂ محبت کا مشاہدہ کیا ہے ۔ اور ان کا یہ مشاہدہ ایک حقیقت پسندانہ اہمیت کا حامل ہے ۔ اس لیے کہ خود شاعر نے غربت اور تنگدستی کا برسوں اپنی زندگی میں مقابلہ کیا تھا ۔ وہ اپنی شاعری میں قدامت کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ کوئی تصور کی چیز نہیں معلوم ہوتی ۔ وہ ہمیشہ ایک نیا باغ لگانے کی بات کرتے ہیں ۔ جس میں بلبل کو تاجداری حاصل ہو اپنے ہی مذہب کی پیروی ہو ۔ جہاں لوگ لالہ سینہ لگاتے ہوں ۔ بھنورا نرگس کے پھول پر منڈلاتا ہو ۔ جہاں کوئل کی مدھری کوک سنائی دیتی ہو ۔ جہاں باغ کے غلیل اندازوں نے گیدڑوں کو مار بھگایا ہو اور چیلیں گوشت کھانا چھوڑ کر پرہیز گار بن گئی ہوں ۔ جہاں سورج کی کرنیں پہاڑیوں کی سر بفلک برفانی چوٹیوں کو منور کرتی ہوں —— بہر حال وہ آنے والے کل کے کشمیر کو ایسا ہی گلشن بنانا چاہتے ہیں ۔ جہاں عوام بغیر کسی خوف و ہراس کے امن چین کی زندگی گزار سکیں ۔ چنانچہ "پیرزادی" میں شاعر یوں رقم طراز ہے :

اے حسین کسان لڑکی
تو چشموں کے سبزہ زار پر لگائی ہوئی تلسی کی طرح ہے
تو اپنے بوسیدہ کپڑوں میں بھی

ایسی حسین دکھائی دیتی ہے جیسے
بادل کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان سے
چاند نظر آتا ہے !
تو جب نغمہ چھیڑتی ہے تو تری مسحور کن آواز سن کر
پریاں بھی رقص کرنے لگتی ہیں
تیرے حسن میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہے !
جب تو باغوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو
کہیں پھولوں نے تیرے کان تو نہیں بھر دیے ہیں ؟
شہزادیاں تیرا کیا مقابلہ کریں گی ؟
تو، تو پھولوں کے سنگ، محفل آراستہ کرتی ہے
شہزادیاں تو در اور دریچے بند کر کے پڑی رہتی ہیں
مگر تیری مدبھری آنکھیں شرم و حیا کے پانی سے
لبریز ہیں !
تجھ میں غیرت و خودداری کی جلوہ آرائی ہے
پسینے سے نم تیری آنکھیں تلوار کی دھار کا کام کرتی ہیں
ہر دیکھنے والے کا دل موہ لیتی ہیں !
مگر اے شراب سے لبریز جام
دیکھنا کہیں تیرے ہوش و حواس تو گم نہ ہو جائیں
دوسروں کو دیکھ کر
عیاشی اور کاہلی کی عادت نہ پڑ جائے !
اے حسین کسان لڑکی !
میں نے تجھے کھیت کے ٹکڑے پر کام کرتے دیکھا ہے
جہاں تو تکان سے چور ساتھیوں کو

اپنے مسحور کن نغمے سنا کر
کام کی جانب مائل کر رہی تھی!
کہیں تو، تو نہیں تھک گئی ہے؟

اس نظم میں کشمیر کی کسان زادیوں کو جس خود اعتمادی کا درس دیا گیا ہے۔ وہ مہجور کا ایک ناقابل فراموش پیام ہے ان کی اور ایک مشہور نظم "کشمیری عورت" ہے جس میں موجودہ کشمیری سماج اور خاص طور پر عورت کی پسماندگی کا ذکر کر کے شاعر نے ایک ایسا پیام دیا ہے کہ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کی خاطر "جھانسی کی رانی" اور "دروپدی" کا روپ دھار لیتی ہیں۔ آج بھی عیدوں اور تہواروں کے موقع پر عورتیں اس نظم کو ایک مذہبی گیت کے طور پر گاتی ہیں۔ مہجور کی ایک اور نظم "طلوع صبح بہار" کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو ایک طرح سے سیاسی رنگ لیے ہوئے ہے:

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سنا ہے، سپر گل ولالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہار جمال
مہک اٹھا ہے جو بوئے وفا سے وادی دل

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبار جور خزاں
فسانۂ شب ہجراں بھی لوگ بھول گئے
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوع صبح بہار

اسی طرح سے وہ ایک نظم میں آنے والے کل کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ بڑا دل موہ لینے والا ہے۔

سیاہی شب ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
افق سے جھانک رہی ہے نگار صبح وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن

نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامن صد رنگ ہے بہار نظر

مہجور کی ایک نظم کو نیشنل کانفرنس نے اپنے قومی ترانے کے طور پر بھی اپنایا تھا۔ جو خیالات اور طرز بیان کے لحاظ ہندستان کے قومی ترانے سے ملتا جلتا ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔

چند سال پہلے نیشنل کانفرنس نے نئے کشمیر کی تعمیر کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ اس میں کشمیری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا تھا۔ جس کے خواب مہجور مدت العمر دیکھتے رہے۔ لیکن مہجور کا یہ خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آنے والے کل کی زبان کشمیری ہی ہوگی۔ جس کے پیچھے سینکڑوں سال کی تاریخ، تہذیب اور روایات کا بہت بڑا اساسہ موجود ہے جو اس زبان کے تابناک مستقبل کی نشان دہی کر رہا ہے۔

یہ مضمون ۸۸ ۱۹ء میں سری نگر میں منعقد مہجور سیمینار میں پڑھا گیا جس کا اہتمام ساہتیہ اکیڈمی نئی دلی نے کیا تھا۔

سری نواس لاہوٹی ۱۷؍اکتوبر ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے انھوں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حیدرآباد اور الٰہ آباد میں حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے ساتھ ساتھ کامریڈ ایسوسی ایشن سے بھی وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک محترمہ سروجنی نائیڈو کے پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کئی بار سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل گئے۔

لاہوٹی صاحب نے چھے سال تک روزنامہ "پیام" میں کام کیا۔ ۱۹۷۱ء سے اب تک اردو، ہندی، دونوں زبانوں میں لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک ہندی پرچارنی سبھا سے منسلک رہے۔

لاہوٹی صاحب طویل عرصے تک انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عام کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پسند مصنفین، افرو ایشیائی انجمن اور ہند سویت دوستی کی انجمن سے بھی منسلک ہیں۔ روس اور یورپ کے بعض ممالک کے سفر بھی کر چکے ہیں۔

تیلگو ادب کی تاریخ (ہندی) کے وہ نگراں رہے اور اردو ہندی، ہندی اردو اور تیلگو ڈکشنریوں کی ترتیب میں بھی حصہ لیا۔ اس وقت ان کی تین کتابیں زیر ترتیب ہیں۔

ISBN 81 - 7160 - 013 - 1